اردو شاعری میں سماجی مسائل

(خصوصی مطالعہ ناصر کاظمی، ساغر صدیقی)

ڈاکٹر محمد زمان پرویز

ناصر کاظمی کی شاعری سماجی مسائل کی ترجمان

سید ناصرؔ رضا کاظمی یکم دسمبر ۱۹۲۳ء (بعضہ کتابوں میں ۱۹۲۵ء۔ ۱۹۲۶ء بھی درج ہے) میں انبالہ شہر کے ایک محلہ قاضی داڑہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد سلطان کاظمی اور والدہ ماجدہ کا نام کنیز محمدی بیگم تھا۔ تعلیمی حوالے سے مشن گرلز سکول، نیشنل ہائی اسکول پشاور، ڈی۔ مڈل اسکول ڈکشائی، مسلم ہائی سکول انبالہ، اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور سے اکتساب فیض حاصل کیا۔ ان کی شادی ۷ جولائی ۱۹۵۲ء کو شفیقہ بیگم سے (جو اس وقت ساہی وال میں مقیم تھیں) ہوئی۔

ناصرؔ کاظمی شاعری کے علاوہ، مصوری، باغ بانی، گھڑ سواری شطرنج، کبوتر بازی اور سیر و تفریح جیسے مشاغل سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کی وفات معدے میں سرطان کی وجہ سے ۲ مارچ ۱۹۷۲ء (کچھ تاریخ ادب کی کتابوں میں ۱۹۷۴ء بھی درج ہے) میں لاہور میں ہوئی اور انہیں مومن پورہ لاہور قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

ان کی تصنیفات میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "برگ نے" (غزلیں) کے عنوان سے ۱۹۵۲ء میں "دیوان" (غزلیں) ۱۹۷۲ء میں "پہلی بارش" (غزلیں) ۱۹۷۵ء میں "نشاط خواب" (نظمیں) ۱۹۷۷ میں "سُر کی چھایا" (منظوم ڈرامائی ۱۹۸۱ء میں) "خشک چشمے کے کنارے" (نثر) ۱۹۸۲ء میں اور ان کی ڈائری "چند پریشان کاغذ" (نثر) ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انتخاب میر، انتخاب نظیر، انتخاب ولی اور انتخابِ انشا بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔

ان کی شاعری سماجی مسائل کے مختلف رنگ لیے ہوئے ہے اور ہر رنگ اپنی الگ حیثیت اور منفرد پہچان کا مالک ہے۔ اس سے پہلے کہ ان تمام مضامین کو ہم زیرِ بحث لائیں جو مختلف صورتوں میں موجود ہیں اور سماجی مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ہمیں ان محرکات کا

جائزہ لینا ہو گا جن کی بد دولت ان کی طبیعتِ ناساز میں معاشرتی کرب اور معاشرتی احساس پیدا ہوا۔ کوئی بھی شاعر عالمِ غیب میں بیٹھ کر فن تخلیق نہیں کر تا بل کہ اس کے ذاتی احساسات اور اجتماعی حالات ہی اس کے ذہن کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جب تک ان تمام حالات وواقعات اور اسباب تک رسائی حاصل نہ ہو جائے۔ کسی بھی فن کار کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ ناصر کاظمی کے حوالے سے بھی اسی اصول کو اپنانا ہو گا اور تمام منزلیں طے کرنا ہوں گی۔

خاندانی پسِ منظر:

ناصر کاظمی سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا شجرہ نسب دیکھا جائے تو وہ حضرت امام موسیٰ کاظم کی پیڑی میں سے ہیں۔ ان کے والدِ محترم محمد سلطان فوج میں ملازم تھے اور انہوں نے دو شادیاں کی تھیں پہلی شادی جعفری بیگم سے ہوئی جن سے حامد حسین اور محمدی بیگم تھے اور دوسری شادی کنیزہ محمدی بیگم سے کی جن کے بطن سے ناصر رضا اور عنصر رضا پیدا ہوئے۔ محمد سلطان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بھلامانس سادہ لوح اور نیک سیرت انسان تھے۔ وہ مذہبی لحاظ سے ایک پہچان رکھتے تھے اور ان کو مذہب سے خاص لگاؤ تھا ان کو گھوڑے پالنے کا بڑا شوق تھا اور وہ گھوڑوں کی نسلوں سے خوب واقف تھے اور ان کے علاج معالجے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو ہر بات میں مبالغہ آرائی کا شوق بھی تھا اور وہ مبالغہ آرائی سے کام لیتے تھے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان اپنے معاشرے سے سیکھتا ہے اور بعض خوبیاں اور خامیاں اُس کو وراثت میں ملتی ہیں۔ ان کو گھڑ سواری، مبالغہ آرائی جیسی خوبیاں اپنے باپ سے وراثت میں ملیں۔ ان کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ اپنی باتوں کی گرفت میں پکڑ کر ایسی جادوئی کیفیت طاری کر دیتے ہیں کہ ان کے سحر کا اثر زائل ہونے کی بجائے بڑھتا جاتا ہے۔

ناصر کاظمی سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا پورا خاندان سید تھا۔ بعض لوگ ان کو سید نہیں گردانتے مگر یہ بات سچ ہے کہ ناصر کاظمی سید تھے جو قاضی واڑہ

میں رہتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد چند پورہ سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ شروع شروع میں ان کے خاندان کو ناقدری کا سامنا کرنا پڑا اور اُن کو اجنبیت بھی محسوس ہوئی، مگر بدلتے وقت کے ساغر نے اپنی الگ سے پہچان بنائی اور ان کے خاندان کو وہ پذیرائی ملی جس کا وہ حق دار تھا۔ احمد عقیل روبی کے الفاظ میں:

> "ناصر کاظمی سید زادے تھے۔ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتے تھے کبھی موڈ میں ہوتے توری دے کر قبولیت کی سند ساتھ ہی دے دیا کرتے تھے جاؤ سید ہوں دے دیتا ہوں اپنے لیے تو کبھی کچھ نہیں مانگا، سید مگر کسی کی سفارش کرے تو ان کو فوراً مان لینا ہے۔"(۱)

احمد عقیل روبی کی یہ بات ناصر کاظمی کے سید ہونے کا عمدہ ثبوت پیش کرتی ہے اور ساتھ میں ان لوگوں کے طعنوں اور بد سلوکیوں کا جواب بھی دیتی ہے جنہوں نے ناصر کاظمی کے خاندان کو سید ماننے سے انکار کیا۔

ناصر کاظمی، بچپن، شرارتیں اور وقتِ بلوغت:

کسی بھی شخص کا بچپن اپنی ایک مخصوص پہچان رکھتا ہے۔ ہر انسان میں اچھی اور بری خامیاں پائی جاتی ہیں جو کہ ایک فطری عمل ہے۔ بچپن میں انسان مختلف مواقعوں پر مختلف رنگ میں نظر آتا ہے۔ اس میں شوخی نزاکت اور معصومیت پائی جاتی ہے اور یہ معصومیت بعض اوقات اس کے ذہن کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ظاہر کرتی ہے اورانسان اپنے ماحول سے سیکھتا ہے اور انسانی عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ بچے کی پرورش میں ماحول کا خاصا ردِ عمل ہوتا ہے، تمام بچوں میں ذہنی صلاحیت ایک جیسی ہوتی ہے مگر اس کا استعمال کوئی کوئی کرتا ہے۔ ان کا خاندان خاصا دولت مند تھا اور روپے پیسے کی خاصی ریل پیل تھی۔ اس لیے ان کو خداوندِ عظیم نے بچپن میں دولت سے نوازا اور آسودہ حالی نے ان کو ہمیشہ خوش مزاج بنائے رکھا۔

ان کے والد فوج میں ملازم تھے اس لیے ان کے مختلف مقامات پر تقرر و تبادلے

ہوتے رہتے تھے اوران کو بھی سیر و تفریح کے مواقع ملتے تھے اور ان کو فطرت سے خاصا لگاؤ تھا اور انہوں نے مختلف تہذیبوں کو دیکھا اور ان میں بھی جھانکا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر انسان دوستی اور فطرت سے قربت سرایت کرتی گئی اور وہ ان کی شاعری کا حصہ بن گئی۔

یہ بات درست ہے کہ ان کا بچپن خاصا خوش گوار تھا اور ان کو ہر سہولتِ زندگی تک رسائی حاصل تھی۔ ان کا بچپن سیر وسیاحت میں گزرا اور آخری عمر ان ماضی کی یادوں کو یاد کرنے میں گزری اور ان کو ہر معرکہ سر کر لینے کی عادت تھی وہ بہت ذہین تھے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بم بنایا تھا مگر اس بات کو محض مبالغہ آرائی کہا جا سکتا ہے ڈاکٹر حسن رضوی ان کی ذہانت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ناصر کاظمی کا حافظہ بلا کا تھا دس بارہ برس کی عمر میں اتنا کچھ یاد رکھنا غیر معمول بات تھی۔"(۲)

مختصر یہ کہ ناصر کاظمی بچپن میں نہایت شرارتی ذہن طبیعت کے مالک تھے اور ان کی طبیعت فن کارانہ تھی۔

ہجرت بغرضِ تعلیم:

انسانی زندگی پر بہت سارے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ تعلیم، معاشرہ، معاشرتی مسائل، نفسیاتی مسائل اور سماجی مسائل جیسے عوامل انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ انسان کی زندگی پر سب سے گہرا اثر تعلیم کا ہوتا ہے۔ انسان جس معاشرہ میں رہتا ہے وہ وہاں کے لوگوں کی بود و باش رہن سہن سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے اور سماج میں پائے جانے والے رسم و رواج کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیتا ہے۔ تعلیم انسانی زندگی کا لازمی جزو ہے جس کے بغیر انسان کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی جانور ہو۔ انسان میں سیکھنے اور سکھانے کا مادہ موجود ہوتا ہے اور انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے اور زندگی کو بہتر کرنے کے لیے انتھک محنت کرے۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی گھر میں حاصل کی۔ کیوں کہ اس دور میں یہی

دستور تھا کہ زیادہ لوگ اپنی ابتدائی تعلیم گھر سے ہی حاصل کرتے تھے۔ ان کا خان دان نہایت مذہبی تھا۔ نانا، دادا، دادای،ماں باپ سب تعلیم یافتہ تھے اور مذہب کے نہایت قریب تھے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انہوں نے اپنے گھریلو ماحول سے کافی حد تک سیکھااور ان تمام مذہبی عقائد کو اپنایاجو ان کے کنبہ کا وطیرا تھے۔ناصر کاظمی کہتے تھے کہ جس انسان نے قرآن کو نہیں سیکھا اور قرآنی تعلیم کو اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنایا۔ وہ ایک ادیب شاعر تو کیا مسلمان بھی نہیں ہو سکتا۔انہوں نے ابتدائی عمر یعنی اڑھائی سال کی عمر میں اپنی نانی امیر بی بی سے قرآنی تعلیم مکمل کی۔ ان کی نانی ظاہری و باطنی نور سے سرفراز تھیں۔انہوں نے صبر و استغنا، انسان دوستی، برداشت، مشکلات میں اللہ پر بھروسہ کرنا قرآن سے سیکھا۔ یہی ان کا مذہبی عقیدہ تھا کہ غم میں خوشی محسوس کرتے اور اللہ کی رضا کو تسلیم کرتے۔

سیاسی وسماجی مسائل سے دوچار ہونے کے باوجود وہ کبھی نہیں گھبرائے اور لوگوں کی مدد ہمیشہ جاری رکھی۔ اڑھائی سال کی عمر میں انہوں نے بریلی کا سفر کیا اور تھوڑے ہی عرصے بعد انہوں نے نوشہرہ کا بھی سفر کیا حقیقت میں ان کو یہ سفر ان کے والد کے تبادلے کی صورت میں کرنا پڑے اور انہوں نے نوشہرہ میں دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کی۔انہوں نے چوتھی جماعت تک نوشیرہ میں تعلیم حاصل کی۔ جب وہ چوتھی جماعت میں تھے تو ان کے والد کا تبادلہ پشاور ہو گیااور ان کو پشاور جانا پڑااور نیشنل ہائی اسکول پشاور میں ان کا داخلہ کروایا گیااس کے بعد ان کے والد محترم کا مختلف شہروں میں تقرر و تبادلہ ہو تا رہااورانہوں نے مختلف شہروں کی فضاؤں میں سانسیں لیں۔انہوں نے مختلف زبانوں کو سیکھنے اور لوگوں کی نفسیاتی الجھنوں کو سمجھنے میں ابتدائی عمر میں ہی ملکہ حاصل کر لیا تھا۔ مختلف لوگوں سے ملاپ نے ان کی شاعری میں دلچسپ کیفیت پیدا کی جس کا تذکرہ ہم آگے کریں گے۔

دسویں جماعت کے امتحان میں کامیابی کے بعد انہوں نے ایف۔اے کرنے کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلی لیا۔ جب وہ اسلامیہ کالج میں اپنے تعلیم سلسلہ کو جاری

رکھے ہوئے تھے تو اس دوران تحریک پاکستان زوروں پر تھی اور ناصر کاظمی کی شاعری کا ڈنکا بھی بجنے لگا تھا۔ قیامِ لاہور کے دوران ناصر نے اس بات سے آگاہی حاصل کر لی تھی کہ پاکستان کا وجود ممکن ہو گیا ہے اور پاکستان بن کے رہے گا انہوں نے اپنے گھر والوں سے بات کی تھی کہ وہ لاہور یا جو علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے ان میں آجائیں۔ کیوں کہ ان کو پتہ تھا کہ یہ وقتِ ہجرت مسائل کا دریا امڈ آئے گا اور سب کو بہا کے لے جائے گا ان کے مشورہ پر کسی نے عمل نہ کیا کیوں کہ یہ عمل ناممکن تھا۔

ناصر کی شاعری میں ہجرت اور فطرت سے دل چسپی کا ساماں ملتا ہے اس کی وجہ ان کے والد کا مختلف علاقوں میں تبادلہ ہے۔ انہوں نے مختلف تہذیبوں کو جانچا پرکھا اور سیر و سیاحت کو اپنا مشغلہ بنایا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سب سے بڑی ہجرت جو انسان کو معتبر اور فرشتوں پر برتری دلانے والی ہوتی ہے وہ گناہوں سے نیکی کی جانب ہجرت ہے۔ یعنی حصولِ تعلیم کی غرض سے دور دراز علاقوں کی طرف جانا اور اپنی علمی پیاس بجھانا۔ ان کی حصولِ تعلیم کے غرض کے لیے کی گئی ہجرت جو انبالہ سے لاہور تک کی ہے ان کی شاعری میں بڑی اہمیت کا حامل ہے:

> "ناصر کاظمی کے پاس ہجرت کا المیہ اور ماضی کی یاد ایک پورا تخلیقی حوالہ رکھتی ہے۔ ان کے ہاں پائی جانے والی اُداسی بہت سی ایسی نفسیاتی گھتیاں سلجھاتی ہے۔ جو اس تبدیلی کی شاخانہ ہیں جس تبدیلی نے ایک نسل کے دیکھے ہوئے خواب چکنا چور کر دیئے۔"(۳)

انہوں نے جب انبالہ سے لاہور کے لیے تعلیمی ہجرت کی تو انہوں نے کئی دوستوں کی صحبت کو کھو دیا اور ان کی محبت، پیار نے ان کو ہمیشہ ترو تازہ رکھا اور شہر لاہور کی رونقوں نے بھی ان کے دوستوں کی کمی کو پورا نہ کیا۔ انہوں نے پہلی ہجرت تعلیم کی غرض سے کی تھی اس لیے وہ اس ہجرت کو شوق کی ہجرت کہتے ہیں:

دیکھ محبت کا دستور
تو مجھ سے میں تجھ سے دور

تنہا تنہا پھرتے ہیں
دل ویراں آنکھیں بے نور
دوست بچھڑے جاتے ہیں
شوق لیے جاتا ہے دور[۴]

بچپن کی امیری، دل چسپیاں اور مشاغلِ زندگی اور ناصر کی طبیعت

ان کی شاعری میں سماجی مسائل کی نشان دہی اور سماجی مسائل کی پیش کش اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ نہ لیا جائے۔ کیوں کہ ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں جب تک دونوں رخوں کو بہ غور نہ دیکھا جائے تو تصویر کی حقیقت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور تصویر کے پچھلے حصے میں چھپا اصلی چہرہ نہیں دیکھا جا سکتا لہٰذا ان کی شاعری میں سماجی مسائل کی پیش کش تک رسائی اس وقت ہی ممکن ہے جب ہم ان کے ابتدائی مشاغل کو زیرِ بحث لائیں گے۔

موسیقی

ناصر کاظمی فقہ جعفریہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے گھر میں مجالس کا قیام عمل میں لایا جاتا تھا۔ حضرت امام حسینؑ سے عقیدت کی وجہ سے ان کے گھر والے ذکر حسین کی محفلیں منعقد کرواتے تھے۔ ماہِ محرم میں ان کے گھر میں تعزیہ داری ہوتی تھی۔ شاعری کے علاوہ ان کو موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ انبالہ میں کرمو پہلوان کی بیٹھک پر شطرنج کھیلتے تھے اور ان سے گٹار بجانا بھی سیکھتے تھے۔ کیوں کہ ان کے دوست افتخار کاظمی ان دنوں وائلن بجانا سیکھ رہے تھے۔ ناصر کاظمی نے وائلن نہ سیکھ سکے اور گٹار بجانا سیکھنا چاہا مگر جلد ہی اپنا فیصلہ بدلہ اور گٹار بجانا بھی ترک کر دیا۔ ناصر کاظمی موسیقی کے بڑے رسیا تھے اور ان کو موسیقی سے خاصا لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو موسیقی سے دل چسپی ابتدا ہی سے تھی۔ کیوں فنونِ لطیفہ سے دل چسپی ان کو وراثت میں ملی تھی۔ ان کے ننھیال موسیقی کے بڑے قدر دان تھے:

> ”شاعری مجھے اپنے نانا سید نیاز نبی مرحوم اور والدہ محترمہ کنیزہ محمدی بیگم سے ورثہ میں ملی۔۔۔ موسیقی، شعر و شاعری، سوز خوانی دیگر فنون سے خاصی دل چسپی رکھتے تھے۔“[۵]

ناصر کاظمی بڑی خوب صورت آواز کے مالک تھے اور ان کو موسیقی کے راگ بھی آتے تھے۔ ان کی آواز سریلی تھی اور کانوں میں رس گھول دیتی تھی۔ انہوں نے جب جان لیا کہ وہ موسیقی میں اچھا نام نہیں کما سکتے تو انہوں نے گانا بجانا چھوڑا اور شاعری کی جانب دھیان دیا۔ ناصر کا مزاج بچپن سے عاشقانہ تھا اس لیے انہوں نے اپنی شاعری میں نئے خیالات کو جگہ دی اور موسیقی کی مختلف دھنوں کو اشعار میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔

موسیقی کے ساتھ مصوری کا رنگ

ناصر کاظمی کی آواز میں درد تھا۔ وہ سُروں سے خوب واقف تھے اور ان کو موسیقی سے خاصا لگاؤ تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ گئے تھے کہ موسیقی سیکھنے کے لیے وقت درکار ہے تو انہوں نے موسیقی سیکھنا ترک کر دیا مگر موسیقی سے لگاؤ نہیں چھوڑا اور سُروں سے دوستی مرتے دم تک رکھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سارنگی کو توڑ دیا تھا اور مصوری میں دل چسپی لینا شروع کر دیا تھا۔ ان کی طبیعت اور مزاج میں تضاد تھا، وہ کوئی بھی کام دل جمی سے نہیں کرتے تھے سوائے شاعری کے، شاعری وہ واحد کام تھا جس کو انہوں نے دل جمی کے ساتھ کیا۔ ان کی موسیقی پر کوئی خاص گرفت نہ تھی لیکن وہ موسیقی اور لفظ کے رشتوں سے واقف تھے۔ وہ موسیقی اور ترنم سے حظ اٹھاتے تھے بہ قول منیر احمد شیخ:

> "میں نے حضرت علیؑ کے خطبے پہلی مرتبہ اس کی زبان سے سنے۔ موسیقی اور لفظ رشتہ اس نے کئی محفلوں میں ہم پر عیاں کیا۔ وہ اس وجود کی سطح پر نہیں جیتا تھا کہ جس پر ہم سیدھے سادے دنیادار جیتے ہیں۔"(۶)

انہوں نے موسیقی اور مصوری میں کوئی خاص نام نہیں کمایا۔ البتہ انہوں نے مصوری اور موسیقی سے محبت کا عمدہ ثبوت پیش کیا ہے۔ وہ مصوری سے خاصا لگاؤ رکھتے تھے مگر موسیقی اور مصوری کے حقیقی رشتے تک رسائی حاصل نہ کر سکے اور نہ ہی مصوری میں شہرت حاصل کر سکے البتہ مصوری سے عقیدت کرتے رہے۔

شطرنج

شطرنج انسانی ذہانت کو پرکھنے والا کھیل ہے۔ اس کھیل سے انسانی صلاحیتوں کا پتہ چلتا

ہے۔ ناصر بھی ایک ذہین شخصیت کے حامل تھے اور شطرنج کھیلنے میں وہ ماہر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کرموں چاچا کی بیٹھک پر شطرنج کھیلتے تھے اور ساتھ میں موسیقی سیکھتے تھے۔ شطرنج ان کا پسندیدہ کھیل تھا جو وہ تادمِ آخر کھیلتے رہے۔ عنصر کاظمی کے بقول:

> "پاپا جی کو شطرنج کا شوق ابتدا سے تھا۔ وہ چچا افتخار کاظمی کے ساتھ شطرنج کھیلتے یا پھر کرموں پہلوان کے گھر بیٹھک میں شطرنج کی بیٹھک جمتی، شطرنج کھیلنا اور اس کے داؤ کو سمجھنا اس زمانے میں بھی غیر معمولی بات تھی۔ پاپا جی کے ایک دوست ہوتے تھے جو مکھی شاہ کے مزار کے پاس رہتے تھے ان کا نام تھا اسحاق، وہ گیم وارڈن تھے۔ ہر اتوار کو پاپا جی ان کے ساتھ شطرنج کھیلتے یا پھر شکار کو جاتے۔"(۷)

ناصر کاظمی کے خان دان میں شطرنج کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ کیوں کہ ان کے خان دان والے سمجھتے تھے کہ شطرنج یزید کا کھیل تھا اس لیے سادات کے گھرانوں میں اسے کھیلنا معیوب ہے۔ اس لیے وہ کرموں پہلوان کی بیٹھک پر شطرنج کھیلتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی انہوں نے شطرنج کھیلنا جاری رکھا اور اپنی پسندیدگی کا عمدہ ثبوت فراہم کیا۔

گھڑ سواری اور شکار

ناصر کاظمی کا خان دان گھڑ سواری میں ایک نام رکھتا تھا۔ ان کو گھڑ سواری کا بہت شوق تھا اور وہ گھڑ سواری کا تذکرہ اکثر اپنی محفلوں میں کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو گھوڑوں کی نسلوں سے آگاہی تھی اور وہ گھوڑوں کا علاج بھی جانتے تھے۔ مگر ناصر کاظمی کے قریبی دوست شہرت بخاری کی کتاب میں اس بات کا تذکرہ ملتا ہے کہ ان کے والد سادہ اور غریب تھے ان کے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا اور نہ ہی ان کے گھر میں شکار کے لیے گھوڑے تھے وہ تو محض ان کے خواب تھے شہرت بخاری کی رائے درست ہے کیوں کہ ناصر نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مبالغہ ان کو وراثت میں ملا ہے اور وہ ہمیشہ مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔

شکار کی بات کی جائے تو یہ بات درست ہے کہ ان کو شکار کھیلنے کا بڑا شوق تھا مگر بعض باتیں جو ناصر نے کی ہیں محض مبالغہ لگتی ہیں اور ان کے شکاری ہونے کے منافی ہیں۔ انتظار حسین

لکھتے ہیں:

"تعجب کی اس میں بات کیا ہے ہیں انہیں دنوں شیر مار کر لایا تھا۔ اس کی چربی میں نے محفوظ کر لی۔ اس کبوتر کو دانہ اسی چربی میں ملا کر کھلاتا تھا۔ پس کبوتر شیر بن گیا بلی قریب آتی تو اسے پنجہ مار کر لہولہان کر دیتا۔"(۸)

انتظار حسین کی اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی مبالغہ آمیزی سے کام لیتے تھے اور مبالغہ آمیزی سے وہ بات میں دل چسپی پیدا کر لیتے تھے۔ مگر وہ بڑے مبالغہ آمیز انسان تھے۔

کبوتر بازی

کبوتر پالنا درویشوں اور رئیسوں کا شیوہ تھا اور انہوں نے کبوتر بازی میں ایک نام کمایا تھا اور ان کو کبوتروں سے بڑی عقیدت تھی اور وہ اپنے کبوتروں کو پیار کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے وقت ناصر نے اپنے کبوتر باوابسنت سنگھ کو دیئے تھے۔ وہ جب بھی کسی مشاعرہ میں جاتے تو وہاں سے کبوتر لاتے تھے۔ ان کو کبوتروں کی نسلوں سے آگاہی حاصل تھی۔ وہ کبوتر کو تیار کرنے کا مکمل طریقہ جانتے تھے۔ ان کے نزدیک کبوتروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ پھیپھڑوں کو ایک نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ وہ بعض اوقات کبوتروں کو غازی کہتے تھے اور آسمانوں کے سفیر بھی۔

آتش بازی اور مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے بغاوت

دوسروں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دینا ناصر کا فن تھا۔ وہ کمال صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کے نزدیک آتش بازی عام کام ہے۔ وہ آتش بازی کے سامان سے نئے نئے تجربے کرتے تھے اور مذہبی تہواروں میں آتش بازی کا مظاہرہ بھی کرتے تھے کہا جاتا ہے کہا انہوں نے بم بھی بنایا تھا اور قیامِ پاکستان اور دورانِ ہجرت ان کے پاس دو بم تھے مگر کوئی واضح دلیل اور ثبوت نہیں ملتے تھے کہ انہوں نے بم بنانے کا کامیاب تجربہ کیا۔ کیوں کہ یہ ایک مبالغہ ہے حقیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ناصر کاظمی مذہبی تنگ نظری کو پسند نہیں کرتے تھے اور وہ ہر تہوار میں حصہ لیتے تھے چاہے وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی۔ ان کے نزدیک انسانیت مذہب سے بڑھ کر ہے کیوں انسانیت ہی

مذہب کی بنیاد ہے اور مذہب سے پہلے انسانیت ضروری ہے۔وہ جانتے تھے کہ مذہب کو بنیاد بنا کر لوگ کس طرح انسانیت کو پامال کرتے ہیں اور مذہب کا سہارا لے کر لوگوں کو لوٹتے ہیں۔

مشاعرے

قیامِ پاکستان کے بعد ان کی شاعری کا چرچا عام ہو چکا تھا اور ہر طرف سے ان کو مشاعروں کے لیے مدعو کیا جاتا تھا وہ دور دراز مشاعروں میں جاتے تھے اور اپنی شاعری کا جادو جگا کر محفل لوٹ لیتے تھے اور ان کی زبان میں گھلاوٹ، مٹھاس تھی جو سامعین کو روح کی تازگی عطا کرتی تھی۔انہوں نے کئی شاعروں کے ساتھ مشاعرے پڑھے مگر وہ یگانہ چنگیزی کو سب سے بڑا شاعر قرار دیتے تھے اور باقی ہم عصر شعراء کی قدر کرتے تھے۔

ازدواجی زندگی اور ناصر

انہوں نے ازدواجی زندگی کا آغاز سات جولائی ۱۹۵۲ء میں کیا۔ ان کی شادی ان کی خالہ زاد شفیقہ بیگم سے ہوئی جو کہ منٹگمری حال (ساہی وال) میں مقیم تھی۔ان کی بیوی نہایت سادہ اور دین دار اور خالصتاً مذہبی خاتون تھی۔انہوں نے کئی جگہ کام کیا اور کئی نوکریاں چھوڑی مگر شفیقہ بیگم کی زبان سے اُف تک نہ نکلی۔انہوں نے بہت کم وقت اپنی بیگم کو دیا کیوں کہ انہوں نے زیادہ وقت دوستوں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ ناصر کی شاعری میں غم اور مسائل ان کے ماضی کی بدولت تھے وہ جب بھی اپنے ماضی کو یاد کرتے تھے تو اشک آنکھ میں اتر آتے تھے۔یہ قول فرزانہ سید:

> "ناصر کاظمی کی ساری شاعری پرانی یادوں، ہجرت کے غم، غم دوراں، خوابوں کی نگری کی آرزو اور اپنے دل کے زخموں کی گل پاشی سے معمور ہے۔"(۹)

مسائل سے گھبرایا ہوا شخص جب ان کی شاعری کو پڑھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کے مسائل کی عکاسی کی ہے اور اس کے جذبات واحساسات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے اور قاری ان کی شاعری کو پڑھنے کے بعد اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے:

ترے ملنے کو بیکل ہو گئے ہیں
مگر یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں

کہاں تاب لائے ناتواں دل
کہ صدمے اب مسلسل ہو گئے ہیں(۱۰)

مایوس نہ ہو اداس راہی
پھر آئے گا دورِ صبحگاہی
پھر اہلِ وفا کا دور ہو گا
ٹوٹے گا طلسمِ کم نگاہی(۱۱)

انہوں نے ہمیشہ سماجی مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان کے ذاتی مسائل میں معاشرتی مسائل نظر آتے ہیں۔ کیوں وہ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ معاشرے کے اثرات انسان پر پڑتے ہیں اس لیے سماج کے مسائل ان کے ذاتی مسائل تھے۔

ناصر کی شاعری میں سماجی مسائل کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں ان کی شاعری کے اہم موضوعات کا تفصیلی جائزہ لینا ہو گا۔ کیوں کہ ہر موضوع شاعری انسانی زندگی کا حصہ ہوتا ہے اور شاعری میں سماجی مسائل کا پایا جانا فطری عمل ہوتا ہے۔ شاعر معاشرے کی احساس ترین شخصیت ہوتا ہے۔ لہٰذا اہم ناصر کی شاعری میں سماجی مسائل کی نشان دہی کرنے کے لیے ان کی شاعری کے محبوب موضوعات کو زیرِ بحث لائیں گے تاکہ کچھ پوشیدہ مسائل سامنے آسکیں اور ان تک رسائی ہو سکے۔

ہجرت مسائل کی جڑ

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

ہجرت ایک سماجی المیہ ہے۔ ہجرت کا دکھ اور مسائل انسان کو لاچار بنا دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہر اُس شخص پر واضح ہوتی ہے جس نے ہجرت کی ہو ہجرت کا درد، کرب اور مسائل وہی انسان جانتا ہے جس پر یہ قیامت گزری ہو، ہجرت کرنا محض ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جانا نہیں ہوتا بل کہ ہجرت، ثقافت، وہم رسم و رواج، دوستی، خونی رشتے، دھرتی ماں اور سب سے بڑھ کر

اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا نام ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مسلمانوں نے بل کہ انسانوں نے جو قربانیاں دیں اور اُن قربانیوں کے بدلے میں جو کچھ اُن کو قربان کرنا پڑا اُس کا تذکرہ کرنا خاصا مشکل ہے۔

ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آنا محض کہنے کی حد تک تو ہجرت ہے مگر جو واقعات اس دوران پیش آئے ان کا بیان ان کی شاعری میں ملتا ہے ہجرت کے دوران آنے والے مسائل سے ہر شخص متاثر ہوا تو ایک شاعر جو معاشرے کی حساس ترین شخصیت ہوتی ہے وہ بھلا کیسے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے:

"تقسیم اور اس کے پیدا کیے ہوئے غیر معمولی انتشار نے ہمارے دل میں جو خلش اور بے تابی پیدا کی ہے اس کی کسک ہماری غزل میں بھی آئی ہے اس کی غم انگیز صدائیں تقریباً سبھی غزل گو شعراء کے ہاں سنائی دیتی ہیں۔"(۱۲)

انہوں نے ہجرت کی تبدیلی کے اثرات کو تہ دل سے قبول کیا اور ان اثرات کو اپنی ذات میں شامل کر لیا۔ ان کی شاعری میں ہجرت کے زیر اثر پیدا ہونے والے مسائل کی کش مکش نے قاری کو سوچنے پر ہی نہیں مجبور کیا بل کہ انسانی عقل کے کئی روپوش حقیقتوں سے پردہ اُٹھایا ہے:

شہر لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ لائی مجھ کو(۱۳)

انہوں نے اس بے درد ہجرت کو اور اپنے نئے وطن کو دلی طور پر تسلیم نہ کیا اور دکھوں اور تکلیفوں کی کسک انہوں نے ہمیشہ محسوس کی اور تادم آخر اس ہجرت کو ناکامی زندگی قرار دیتے رہے۔

انسان چاہے جتنا بھی سخت دل ہو اُسے احکامِ خداوندی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے بھی خداوندِ عظیم کے احکام کو تسلیم کیا اور ہجرت اور تقسیم کے عمل کو قبول کر کے اپنے انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ مگر ہجرت کا دکھ اور تکالیف ان کی شاعری ہمیشہ حصہ بنی رہیں ڈاکٹر انور صابر کے خیال میں:

"تقسیم کے فوراً بعد کے اجتماعی غم و الم، انتشار اور ہجرت و فسادات کے حوالے سے ناصر کی غزل میں انتہائی شخصی لہجے کے باوجود اجتماعی زندگی کے

کرب کے تجربے اور ماضی کی یادوں کو جس دھیمے لب ولہجے میں تغزل کی
اچھوتی شان اور نئے طرزِ احساس کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ اردو غزل میں
گراں قدر اضافے کی مسلمہ حقیقت ہے۔"(۱۴)

دورانِ ہجرت لوگوں کو جان کے لالے پڑ گئے اور لوگ قافلوں کی صورت میں ہندوستان سے نکلنا شروع ہوئے۔ چند روپوں کے علاوہ سارا سامان ہندوستان چھوڑ آنے والے مسلمان جب سرزمین پاکستان پہنچے تو ان کے خواب جو انہوں نے دیکھ رکھے تھے ادھورے کے ادھورے رہ گئے اور جو لوگ خون کی بستیوں سے گزر کر پاک سرزمین پہنچے تو ان کے ساتھ جو ظلم ہوئے اس کی مثالیں ملنا مشکل ہیں۔ جو مسلمان جان بچا کر پاکستان پہنچے تو ان کی عصمتوں کے دیے پاکستان میں بجھائے گئے۔ لوگ قافلوں کی صورت میں جب پاکستان آئے تو ان کو رہائش کا اور اشیائے خورونوش کا مسئلہ پیش آیا۔

مہاجرین کے لیے کیمپ لگائے گئے مگر ان کیمپوں میں سہولیات زندگی نا ہونے کے برابر تھیں اور اس کے علاوہ غیرت مند مسلمان بھائیوں نے اپنی بہنوں کی عزتوں کی حفاظت ہندوستان میں تو کی مگر پاکستان میں ان کی عزتیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ انسان جو اشرف المخلوقات کا درجہ رکھتا تھا شیطان کا پیروکار بن گیا اور انسانیت سے دور ہو کر رہ گیا تو ان کو بھی دکھ ہوا اور انہوں نے چیخ و پکار کی کہ وہ غیرت مند مسلمان کہاں رہ گئے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی عزتوں کے لیے جان کی قربانی دی۔ مگر اب افسوس ہوتا ہے کہ وہ مسلمان انسان سے شیطان ہو گئے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد جب وہ لاہور آئے تو کہیں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملی تو وہ ماضی کو یاد کر کے زار و قطار روئے۔ وہ شطرنج کی محفلیں وہ دوستوں کی مجلس وہ شکار کھیلنا اور کبوتر اڑانا سب کے سب کھیل محض خواب تھے جو انہوں نے دیکھے تھے ان کو یاد کر کے وہ ہمیشہ روتے تھے۔ ہجرت کے بعد انسانی ذہن میں نت نئے سوالات نے جنم لیا۔ ناصر نے تمام سماجی مسائل سے پردا اٹھایا جو مسلمانوں کو ہجرت کے بعد درکار تھے۔ ایک دفعہ جب ان کے دوست احمد عقیل روبی نے ان سے ہجرت کے بارے میں پوچھا تو وہ کہتے ہیں:

"(احمد عقیل روبی) میں بڑی دیر تک ان کی آواز سے لطف اندوز ہوتا رہا ہے
پھر اچانک ایک غیر متعلقہ سا سوال کیا۔ ناصر بھائی کبوتروں کے جاگنے کا

وقت کیا ہے؟ (ناصرؔ) ان کے جاگنے کا کوئی وقت نہیں لیکن سر گودھا والا
میرا کبوتر سوتا ہی نہیں اسے اب تک سر گودھا سے ہجرت کرنے کا دکھ
کھائے جارہا ہے سوتا ہی نہیں۔"(۱۵)

ان کو مخلوق خدا کی جذباتی کیفیت کا بڑا اندازہ تھا وہ انسانوں کیا جانوروں کے جذبات کی بھی خوب صورت عکاسی کرتے تھے یعنی انسان پر جو ہجرت کے دوران گزری سو گزری ایک کبوتر ہجرت کے دکھوں کو سینے میں چھپائے ہوئے ہے اور کبھی بھی ان دکھوں کو نہیں بھول سکتا تو انسان کیسے بھول سکتا ہے انہوں نے ہجرت کے مسائل کو اپنی ذات میں شامل کر کے بیان کیا اور ماضی کو یاد کر کے حال کے مظالم کو پر نوحہ خوانی کی۔ ناصر نے ہجرت کے مسائل کو اس مخصوص انداز میں پیش کیا کہ قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ان کی شاعری میں ہجرت کے مسائل واضح الفاظ میں ملتے ہیں:

نہ آنکھیں ہی برسیں نہ تم ہی ملے
بہاروں میں اب کے نئے گُل کھلے
نہ جانے کہاں لے گئے قافلے
مسافر بڑی دور جا کر ملے
وہی وقت کی قید ہے درمیاں
وہی منزلیں اور وہی فاصلے
جہاں کوئی بستی نظر آگئی
وہیں رک گئے اجنبی قافلے
تمہیں دل گرفتہ نہیں دوستو
ہمیں بھی زمانے سے ہیں کچھ گلے
ابھی اور کتنی ہے میعادِ غم
کہاں تک ملیں گے وفا کے صلے(۱۶)

شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں(۱۷)

پیارے دیس کی پیاری مٹی
سونے پر ہے بھاری مٹی
کیسے کیسے بُوٹے نکلے
لال ہوئی جب ساری مٹی
تیرے وعدے میرے دعوے
ہو گئے باری باری مٹی
گلیوں میں اڑتی پھرتی ہے
تیرے ساتھ ہماری مٹی(۱۸)

ہجرت نے کئی گھروں کو تہس نہس کر دیا اور خوشیاں ماتم میں بدل گئیں اور ہنسی خوشی زندگی گزارنے والے دکھوں کے پجاری بن گئے اور کئی عزتیں ہجرت کی بھینٹ چڑھ گئیں جو خواب وطنِ عظیم کے لیے قربانی کے بعد دیکھے گئے تھے چکنا چور ہو گئے اور وہ لوگ جو خوش حال تھے ایک لقمے کو ترس گئے۔

انسانی فطرت کا یہی تقاضا ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی قدر نہیں کرتا مگر جب اُس سے دور ہوتا ہے تو اُسے اس کی قدر کا احساس ہوتا ہے۔ ناصر نے اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ اور غم اور تکلیفوں کو خوب صورت الفاظ کا جامہ پہنا کر بیاں کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ماضی کو یاد کر کے اشک فشانی کی رسم کو تقویت دی ہے اور اشکوں کے سیلاب کو تادمِ آخر تھمنے نہیں دیا۔ ان کے بچپن کے دوست، احباب رشتہ دار جن کی خدمت ان کا سکونِ دل تھی وہ ایک پرانے کاغذ کی طرح گم ہو گئے تھے تو بھلا ایک احساس شخصیت ان کو یاد کر کے کیسے نہ اشک بہائے اور اپنے ماضی کے دنوں کا تذکرہ کیسے نہ کرے:

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

وہ صبح آتے آتے وہ گئی کہاں
وہ قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے
میں اُن کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے
یہ کون لوگ ہیں مرے ادھر اُدھر
وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوئے
وہ دل میں کھبنے والی آنکھیں کیا ہوئیں
وہ ہونٹ مسکرانے والے کیا ہوئے
عمارتیں تو جل کر راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے
اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے
یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمین کا بوجھ اُٹھانے والے کیا ہوئے[۱۹]

"ناصرؔ کی شاعری اور ہجرت کی واردات ہمارے تصور پر ایک ساتھ وارد ہوئی۔ بل کہ ناصر ہی نے ہمیں ہجرت کے المیہ کو محسوس کرتے سکھایا ہجرت کے معنی صرف ایک سر زمین کو چھوڑنا نہیں تھا یہ صدیوں کے انسانی رشتوں کو چھوڑنے اور ایک بالکل نئی صورت میں از سر نو زندگی شروع کرنے کا مسئلہ تھا۔"[۲۰]

زندہ دل انسان ہمیشہ دوسروں کی قدر کرتا ہے اور نئے معاشرے میں خود کو نئے رنگ میں ڈھال لیتا ہے۔ ناصر نے خود کو نئے دوستوں کی صحبت سے مستفید کیا مگر پرانے دوست بھلا وہ کیسے بھول سکتے تھے جن کے ساتھ زندگی کی اچھی بہاریں دیکھی ہوں وہ بھلا بھولنے کے قابل ہوتے ہیں انہوں نے ہمیشہ اپنے دوستوں کو یاد رکھا اور ان کی کمی کو ہمیشہ محسوس کیا:

دل ویراں میں دوستوں کی یاد
جیسے جگنو ہوں داغ میں گل کے (۲۱)

دن بھر تو میں دنیا کے دھندوں میں کھویا رہا
جب دیواروں سے دھوپ ڈھلی تم یاد آئے (۲۲)

قیامِ پاکستان کے بعد مفاد پرست طبقہ نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے اور جو لوگ قیامِ پاکستان کے مخالفین میں سے تھے انہوں نے اپنے نام کئی جائیدادیں اور مکان الاٹ کروائے مگر جنہوں نے عظیم قربانیاں دیں ان کے حصہ میں گلیوں کی خاک اور غربت آئی اور افلاس نے ان کی زندگی اجیرن کی۔ ناصر کی شاعری میں ان مسائل کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے یہ قول:

> "زمانے کے حالات، گرد وپیش کے واقعات اور عصری میلانات کی ترجمانی اور عکاسی تو ان کی غزل کا ایک پہلو ہے اس کے علاوہ دوسرے ان گنت پہلوؤں کو بھی انہوں نے غزل میں داخل کیا ہے مثلاً ناساز گار سماجی ماحول اور ایک غلط نظام اقدار میں زندگی جن حالات سے دوچار ہوتی ہے اس کی تفصیل بھی انہوں نے اپنی غزلوں میں پیش کی ہے۔ اس نظام نے زندگی کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی نظریں گھر گھر پھیلے سوگ کو پھیلا ہوا دیکھتی ہیں لوگ انہیں دن دن بھر گلیوں میں بیکار پھرتے اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔" (۲۳)

ناصر کاظمی کی شاعری ذاتی حدود قیود سے بالاتر ہے اور وہ معاشرتی اور سماجی مسائل کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ پورے معاشرے کے غموں کو اپنے سینے میں دفن کر لیتے ہیں اور زمانے کے دکھوں سے پریشان نظر آتے ہیں۔

ان کی شاعری میں شکستہ خوابوں کا المیہ واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد رقم طراز ہیں:

> "ہجرت کے تجربے نے ناصر کو اس حد تک اسی لیے متاثر کیا اور اسی لیے وہ

اس کی جان کا روگ بن گیا کہ اس تجربے میں مقام و وقت دونوں سے ناصر کی دوری اور اجنبیت کا احساس بیک وقت جمع ہو گیا تھا۔ اگلے وقتوں اور پرانی صحبتوں کی یادیں ناصر کی شاعری کا اندوختہ بن کر رہ گئی تھیں یہ اجنبی مسافر تمام عمر مقام و وقت کی ایک دنیا میں کھڑا مقام و وقت کی ایک دوسری دنیا کے خواب دیکھتا رہا۔"(۲۴)

آبائی وطن سے بچھڑنے کا غم انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے اور زمانے کے درد اور دکھوں کا محافظ بنا دیتا ہے۔ ناصر نے جب انبالہ سے ہجرت کر کے پاکستان کو خوابوں کی سر زمین بنایا تو سر زمین پاکستان نے ان کے خوابوں کو چکنا چور کیا۔ ناصر نے شاعری میں نام کمایا اور لاہور کی رونقوں میں دل لگانے کی کوشش کی مگر انبالہ سے محبت کا ثبوت ہمیشہ فراہم کرتے رہے اور ان کی محبت نے انبالہ کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ ناصر انبالہ کو موتیوں کا خزانہ سمجھتے تھے اور اُسے علم کی دنیا میں ایک علمی شہر تصور کرتے تھے مگر جب انبالہ کو لوٹا گیا اور اس کو تباہ و برباد کیا گیا تو ناصر نے خوب اشک بہائے۔ ناصر تو انبالہ کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے اور اس کا تذکرہ اکثر مشاعروں میں کرتے تھے۔ ناصر انبالہ پر فخر کرتے تھے اور انبالہ کی محبت کا اظہار وہ کچھ یوں کرتے ہیں:

انبالہ ایک شہر تھا، سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اُسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی
اے ساکنانِ خطۂ لاہور! دیکھنا
لایا ہوں اُس خرابے سے میں لعلِ معدن
جلتا ہوں داغ بے وطن سے مگر کبھی
روشن کرے گی نام مرا سوختہ تنی
ہر لفظ ایک شخص ہے ، ہر مصرع آدمی
دیکھو مری غزل میں مرے دِل کی روشنی(۲۵)

یہ بات روزِ محشر کی طرح عیاں ہے کہ ناصر کاظمی نے شاعری میں میر کی پیروی کی مگر ان کی شاعری کا اپنا مخصوص رنگ اور لہجہ تھا دونوں کے ہاں درد و غم اور ہجرت کی لذتیں تھیں مگر مزاج اور ذائقہ الگ الگ تھا۔ ناصر نے ہجرت کے مسائل کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے کیوں

ان کی ہجرت جبری ہجرت تھی اور مجبوری کے تحت ہجرت کر رہے تھے مگر میر کی ہجرت کوئی جبری ہجرت نہ تھی بل کہ انہوں نے اپنے مزاج میں تبدیلی کی خاطر ہجرت کی تھی ناصر کی ہجرت زمانے بھر کا غم چھپائے ہوئے ہے اور دکھوں اور غموں سے آراستہ مگر میر کے ہاں ایسی کوئی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ناصر نے جب مسائل کا سامنا کیا تو اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خوابوں کی دنیا میں بس کر دنیاوی مسائل سے منہ پھیر لیا۔ مگر وہ کب تک منہ پھیرتے کیوں وہ بھی مسائل سے دو چار اسی معاشرے کا حصہ تھے اسی لیے ان کو بھی انہی مسائل کا سامنا تھا جو کہ ایک عام انسان کو تھا۔ بہ قول ڈاکٹر حسن رضوی:

> "یہی وہ ہجرت تھی جو ناصر کی تخلیقات میں یادوں کی خوشبو کی طرح محسوس ہوتی ہے اور وہ یہی ہجرت تھی جو انتظار حسین اور ناصرؔ کاظمی کے مابین دوستی اور تخلیق کی قدر مشترک بنی۔ ناصر کاظمی کی شاعری ہو یا نثر یادوں کی خوشبو جگہ جگہ اپنی پہچان کراتی محسوس ہوتی ہے۔"(۲۶)

میرا ساتھی مرا شریک سفر
رہ گیا پچھلی رات کا تارا
کہاں لے آئی رو مجھے تقدیر تُو
میں کہاں آ گیا ہوں میرے خدا
یہاں پھلتا نہیں کوئی آنسو
یہاں جلتا نہیں کسی کا دیا(۲۷)

چمن در چمن وہ رمق اب کہاں
وہ شعلے شفق تا شفق اب کہاں
کراں تا کراں ظلمتیں چھا گئیں
وہ جلوے طبق در طبق اب کہاں
بجھی آتش گل اندھیرا ہوا
وہ اُجلے سنہرے ورق اب کہاں(۲۸)

کیا روئیں فریبِ آسمان کو
اپنا نہیں اعتبار کچھ دیر
آنکھوں میں کٹی پہاڑ سی رات
سو جا دل بے قرار کچھ دیر
اے شہر طرب کو جانے والو
کرنا مرا انتظار کچھ دیر(۲۹)

تھی اور ہی کچھ بات کہ تھا غم بھی گوارا
حالات ہیں اب درد پے جاں اور طرح کے
ہر سال سال تو کلیاں ہی جھڑی تھیں مگر اب کے
گلشن میں ہیں آثارِ خزاں اور طرح کے
لشکر ہے نہ پرچم ہے نہ دولت ہے نہ ثروت
ہیں خاک نشینوں کے نشاں اور طرح کے(۳۰)

پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمیں نگل گئی انہیں کہ آسمان کھا گیا
یہ کس خوشی کی ریت پر غموں کو نیند آ گئی
وہ لہر کس طرف گئی یہ میں کہاں سما گیا(۳۱)

مسائل کی بنیاد، فسادات ِہجرت

جب ہجرت کا وقت آیا تو شرافت کے خوف ناک چہرے سے نقاب اُٹھا اور کئی طرح کے چہرے سامنے آئے جن میں ظالم، منافق، چور اور فسادی تھے۔ وہ تمام انسان جو انسانیت پر کئی طرح سے ظلم ڈھا رہے تھے ان کا حقیقی چہرہ سامنے آیا پہلے پہل تو وہ پس پردہ ظلم ڈھاتے تھے اور انسانوں کو مسائل کی اندھیر نگری میں دھکیلتے تھے مگر دورانِ ہجرت اُن شرفاء کے چہرے سامنے آئے اور انہوں نے قتل و غارت کے دریا بہائے۔ منافقین کے ایک بڑے ٹولے نے قیامِ پاکستان کی مخالفت

کی مگر قیامِ پاکستان کے بعد بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔

انبالے سے نکلتے قافلوں میں سیدوں کا بھی قافلہ تھا اور ناصرؔ اُس قافلے میں موجود تھے ناصرؔ نے اپنی آنکھوں سے لاشوں کے ڈھیر دیکھے اور اشک بہائے۔۔ اس جبری ہجرت نے کئی گھر برباد کیے اور کئی انسان درندگی کا شکار ہوئے۔

فسادات نے ایسے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں کہ تاریخ بھی اشک بہاتی نظر آتی ہے۔ خواہشات کے بہتے سمندر منٹوں میں خشک ہو گئے اور دلی خواہشات حالات اور فسادات کی نذر رہو گئیں شیطانیت نے سرِ بازار رقص کیے اور اپنی جیت کا جشن منایا۔ شیطانیت جو کئی سالوں سے پروان چڑھ رہی تھی وہ اس قدر مضبوط ہو چکی تھی کہ اس کا جوڑ توڑ ناممکن تھا اور اُس کو بے نقاب کرنے کی ضرورت اب نہ رہی تھی اور شیطان کے پیروکاروں نے اپنے آقا کی خوشامد کی خاطر خوب خونی رنگ رلیاں کھیلی۔

> ”رہا فسادات کا مسئلہ تو وہ بھی ناصر کے لیے کم تکلیف دہ ثابت نہ ہوا اقدروں کی پامالی کا نوحہ فسادات کے بطن ہی سے پھوٹتا ہے اور بلاشبہ یہی نوحہ ناصرؔ کی غزل کی اولین شناخت ہے۔“(۳۲)

انسانی قافلوں کو اِس قدر لوٹا گیا کہ انسان انسان نہ رہا بل کہ شیطان بن گیا اور وہ رشتے جو ہندوستان کے لوگوں میں قائم تھے وہ پاش پاش ہو گئے اور الفت و محبت نفرت کی بھینٹ چڑھ گئی۔

ناصر نے عوام کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور وہ عوام کے احساسات و جذبات کو بڑی عیق نظری کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہ عوام کے مسائل کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ عوام کے مسائل نہیں بل کہ ان کے ذاتی مسائل لگتے ہیں۔۔ ناصر نے زندگی کو بڑی باریک بینی سے جانچا پرکھا اور اُس کے تمام اسرار و رموز تک رسائی حاصل کی۔ خوش انسان کی طبیعت بھی زندہ دل ہوتی ہے مگر جب دکھوں اور مسائل کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں تو دکھوں کی نگری ٹھکانہ بن جاتی ہے۔ انہوں نے فسادات ہجرت کے مبہم واقعات سے پردہ اٹھایا ہے

ناصرؔ نے ہجرت اور فساداتِ ہجرت سے پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کیا اور ان کی عکاسی کی ان کی غزلوں میں ہجرت اور جن کو بیان کرنے سے ادیب فسادات ہجرت سے پیدا ہونے والے مسائل بہ درجہ اُتم پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے انسانی اقدار کو پامال کرنے والوں کو بے نقاب

کیا اور انسان کے روپ میں شیطانوں کی شناخت کی ہے۔ ان کی غزلوں میں تمام مناظر ہجرت اور فسادات کے واقعات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے بہ قول:

"اسی لیے جب وہ فسادات کا ذکر کرتا ہے تو محض واقعہ نگاری نہیں کرتا،
انسانی سروں کا ماتم نہیں کرتا بل کہ انسانی قدروں کی پامالی کا ذکر کرتا ہے
اُس کا احساس دلاتا ہے۔"(۳۳)

ناصر کی غزل میں سماجی مسائل کی پیش کش کو مناظر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور وہ مناظر پیش کیے گئے ہیں جن کی بدولت مسائل نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ دورانِ ہجرت مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی گئی اور کھڑی فصلوں کو راکھ بنا دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی عصمتوں کو سرِ بازار پامال کیا جاتا اور بہنوں کو بھائیوں کے سامنے بے آبرو کیا جاتے اور بھائی بے بس انسان کی طرح اپنی عزت کا تماشا دیکھتے رہ جاتے اور کافر نشے میں دُھت ہو کر مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی پر جشن مناتے۔ اس حالت زار کو وہ یوں بیاں کرتے ہیں:

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشن طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے
اک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشنِ جم منائے گئے
کیا کہوں کس طرح سر بازار
عصمتوں کے دیئے بجھائے گئے
وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر
خار و خس کی طرح بہائے گئے(۳۴)

ناصر کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سماجی مسائل کے ساتھ اپنے ذاتی مسائل بھی بیان کیے ہیں کیوں کہ وہ اُسی معاشرے کا حصہ تھے اور وہ بھی اُن مہاجرین میں سے تھے

جو مصائب سے دوچار تھے۔

"اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر کے یہاں سماجی واردات کا کتنا گہرا شعور ہے اور وہ اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز اور معاشی و معاشرتی حالات کے مدوجزر کو کتنی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔"(۳۵)

ناصر نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہجرت سے پہلے لوگ کس قدر خوش حال وخوش خرم تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ ہندو مسلم ایک ہی معاشرے کا حصہ تھے اور ساتھ مل بیٹھ کے اپنے مسائل حل کرتے تھے مگر ہجرت نے سب بدل دیا اور فسادات نے انسانوں کو مسائل سے دوچار کر دیا:

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دِلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بھیکار
راتوں اُٹھ اُٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ
ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اُداس
وہی پرانی باتیں اس کی وہی پرانا روگ(۳۶)

ناصر کہتے ہیں کہ جن امیدوں اور خوابوں کو لے کر لوگ پاکستان آئے تھے وہ امیدیں اور خواب دھرے کے دھرے رہ گئے اور خواب سب دھول ہو گئے اور خلاف قیاسِ واقعات نے لوگوں کو ذہنی اور جسمانی طور پر متاثر کیا اور ایک ہی خاندان کی طرح رہنے والے کئی گھروں میں بٹ گئے۔ انسان حقیقت میں بے بس اور لاچار ہو گیا اور وقت کے بادشاہوں کے آگے جھک گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جوتوں میں دال بٹنے لگی اور فسادات نے تفرقہ بازی کو جنم دیا اور انسانوں کے قتلِ عام پر جشن منانے کا رواج عام ہوا:

چند گھرانوں نے مل جُل کر
کتنے گھروں کا حق چھینا ہے
باہر کی مٹی کے بدلے
گھر کا سونا بیچ دیا ہے

سب کا بوجھ اُٹھانے والے
تو اس دنیا میں تنہا ہے
میلی چادر اوڑھنے والے
تیرے پاؤں تلے سونا ہے(۳۷)

وہ کہتے ہیں کہ یہاں ہر شخص فراڈ کا گرویدہ ہے اور اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے۔ جس انسان میں احساس اور محبت کا جذبہ نہ ہو وہ انسان سب کو مفاد پرستی کی تکڑی میں تول کر اپنا فائدہ نکالتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو مفاد پرست ہوتے ہیں وہ لوگوں کا سکون برباد کرتے ہیں اور زمینیں اور جائیدادیں اکٹھی کر کے عیاشی کرتے ہیں مگر غرباء بے چارے دو وقت کی روٹی کو ترس جاتے ہیں مطلوب حسین کے بہ قول:

"ناصر بالآخر حالات کی وجوہات تلاش کر لیتا ہے کہ یہ قہر و عذاب بلاوجہ نہیں بل کہ معاشرے کے چند بااثر افراد نے صرف اپنی تمناؤں کی تکمیل کے لیے سب کا سکون برباد کر کے رکھ دیا انہیں صرف اپنے سکون سے غرض ہے ایسے لوگوں کو دوسروں کو پریشانیوں سے اور مشکلات سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ ایسے دنیادار لوگ ہیں کہ ہر شے کو کاروبار کی آنکھ سے دیکھتے ہیں جن کے ہاں ہر چیز کو منافع کے ترازو میں تولا جاتا ہے وہ جذبات و احساسات اور پیار محبت جیسے الفاظ سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ ان کے خیال میں یہ الفاظ اپنی اہمیت نہیں رکھتے ایسے لوگ مفاد کی تکڑی ہاتھ میں لیے خلقت کا سکوں برباد کرنے اور فساد برپا کرنے میں ماہر ہوتے ہیں اور پھر انہی فسادات سے وہ اپنے لیے بہت ساماں و دولت زمین اور جائیدادیں اکٹھی کر لیتے ہیں۔"(۳۸)

ناصر کاظمی نے معاشرتی حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے کہ معاشرے کے چند بااثر افراد ہی اپنے مفاد کے لیے غریبوں کا استعمال کرتے ہیں اور غریبوں کی عصمتوں سے کھیل کر اپنی شیطانی ہوس دور کرتے ہیں۔ ناصر نے زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو خاص نکتہ نظر سے پرکھ کر دکھوں اور مسائل سے دوچار افراد کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے اس

کے ہاں بچھڑنے والوں کا درد، دکھ، لٹنے والوں کی آہ و فریاد پائی جاتی ہے:

"ناصر کاظمی کی شعری سلطنت مختلف منطقوں میں بٹی ہوئی ہے تنہائی، اداسی ، فراق، یادیں، قدری زندگی کا تغیر، بچھڑنے والوں کی تلاش ان دیکھے کی جستجو ویرانی اور خرابے اس سلطنت کے مختلف منطقے ہیں۔ اس کی اس سلطنت کا نقشہ بسے ہوئے شہروں ٹھٹھری ہوئی راتوں، سونے راستوں دکھ کے کنکروں اور کانٹوں بے چراغ گلیوں، جلی ہوئی کھیتیوں، پیاسی جھیلوں، بجھے دنوں کے ڈھیروں، خاموشیوں کے دھوپ کے سائبان، زخم وفا آتش خاموش سے مرتب ہوتا ہے۔"(۳۹)

انہوں نے مسائل کو بیان کر کے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے ایسی محبت جو ایک انسان ادوسرے انسان سے کرتا ہے۔ وہ غرباء اور مظلوموں سے خاص اُنس رکھتے ہیں اور ان لوگوں سے نفرت کرتے ہیں جو شرافت کا نقاب اوڑھ کر خون کی ندیاں بہاتے ہیں اور اپنے مفاد کے لیے دوسروں کو استعمال کرتے ہیں۔

ناصر کہتے ہیں کہ فسادات نے مسائل کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور مسائل کی پرورش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگوں کے اثرات اور فسادات کے اثرات کئی سالوں تک رہتے ہیں اور انسان اُن اثرات کو قبول کرتا ہے اور جنگوں کے بعد ہمیشہ قحط پڑھتے ہیں اور انسان دو وقت کی روٹی کو ترس جاتے ہیں کیوں جنگیں قوموں کی تباہی کی وجہ ہوتی ہیں:

کیسی گردش میں اب کے سال پڑا
جنگ سر سے ٹلی تو کال پڑا(۴۰)

یہ دیا سا ہے کیا اھیرے میں
ہو نہ ہو یہ مکان ہے تیرا
یہاں پھلتا نہیں کوئی آنسو
یہاں جلتا نہیں کسی کا دیا(۴۱)

ہجرت و فسادات سے پیدا کردہ مسائل کا بیان ناصر کی شاعری کی زینت ہے۔ ناصر نے

فسادات سے پیدا ہونے والے مسائل کو اپنی شاعری میں بیان کر کے اس موضوع کو امر کر دیا ہے اور شاعری کی روایت میں ایک درخشاں باب کا اضافہ کیا ہے۔ ناصر نے انسانوں کے مسائل بیان کر کے اپنی ہمدردی کا ثبوت دے کر انسانی قدروں کو عظمت عطا کی ہے۔

معاشرتی عدم توازن، معاشرتی نا آسودگی اور عشق و محبت مسائل کی حقیقی وجوہات

انسان پیدائشی طور پر مسائل کا شکار رہا ہے اور انسانی زندگی مسائل کی آماج گاہ ہے۔ انسانی زندگی دکھوں اور پریشانیوں سے دو چار ہے اور مسائل ہمیشہ انسان کو اپنی لپیٹ میں رکھے ہوئے ہیں۔ زندہ انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا کیوں کہ زندگی انسان کو جینے کے طریقے سکھاتی ہے۔ انسانی خواہشات اور ضروریات نے معاشرے میں مسائل کو جنم دیا ہے ۔ مسائل کس طرح پیدا ہوتے ہیں کیوں کر ہوتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ انسانی معاشرے کا باریک بینی سے مطالعہ کے بعد لگایا جا سکتا ہے۔ انسانی معاشرہ کئی طرح کے مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور طبقاتی تقسیم انسانی معاشرے میں معاشرتی عدم توازن کی وجہ بنتے ہیں۔ خوش حال معاشرے کی خوش حالی ہیں وہاں کے لوگوں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ مگر جہاں لوگ انسانیت سے گر جاتے ہیں وہاں خوش حالی تو کیا بدحالی بھی نہیں آتی۔

معاشرتی عدم توازن اور نا آسودگی مسائل کی جان ہیں انہی کی بدولت معاشرے میں مسائل پیدا ہوتے ہیں اور مسائل کی وجوہات میں ان کا کردار بڑا اہم ہے۔ معاشرتی سکون اور اطمینان ہی انسان کی خوشی کو بحال رکھ سکتے ہیں۔ مسائل انسان پر قہر و عذاب ڈھا دیتے ہیں۔ انسان معاشرتی طور پر معاشرے میں ہونے والے اثرات کو قبول کرتا ہے۔ ناصر کاظمی ایک حساس طبیعت کے مالک تھے اور انہوں نے معاشرے میں موجود مسائل کو دیکھا اور پرکھا اور ان مسائل پر روشنی ڈالی۔

انسان جب رنجیدہ ہوتا ہے تو وہ سب سے منہ پھیر لیتا ہے اور انسان اپنے حق کے لیے لڑتا ہے مگر ایک غریب انسان کیا کر سکتا ہے جس کے بس میں کچھ نہ ہو اور وہ دو وقت کی روٹی کے لیے ترسے بھلا وہ اپنے حقوق کی کیا بات کرے کیسے اپنے مفاد اور حق کے لیے لڑے گا۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ دکھوں اور غموں سے دوچار معاشرہ زبردستی مسائل کی لپیٹ میں آ جاتا

ہے اور انسان کو روز گار کا غم اور بھوک افلاس حقائق سے دور لے جاتے ہیں۔

انسان ہمیشہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے لڑتا ہے محنت کرتا ہے اور دوسروں کے حق کو چھیننے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ انسان کو دکھ غم اور درد نے صنعتی مشین بنا دیا ہے اور انسان کے دل سے انسانی جذبات و احساسات کو ختم کر دیا ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے انسان مل جل کر رہتے تھے اور آپس میں دکھوں اور غموں کو بانٹ لیتے تھے مگر ہجرت کے انسان مسائل سے دوچار ہوا اور اُس کے دل سے انسانی اقدار ختم ہوتی گئیں اور مفاد پرستی نے انسانی اقدار کو پارہ پارہ کر دیا:

> ”وہ چین سے سوتی ہوئی بستیوں کے درمیان مارا مارا پھرتا ہے اور اُسے کوئی ہم سفر نہیں ملتا۔ اس کے دیار کی سوئی ہوئی زمین ان لوگوں سے خالی ہو گئی ہے جس کی اُسے تلاش ہے۔ بازار بند ہیں۔ راتیں سنسان اور بے چراغ ہیں تنہا راتوں کا مسافر اداس شاعر دیکھتا ہے کہ کوئی گھر سے نہیں نکلتا۔ اس عالم میں اگر کوئی ملتا بھی ہے تو دل کی بات کرنے یا سننے کے قابل نہیں ہوتا کیوں کہ اب دنوں میں آگ باقی نہیں رہی کوئی چیز جو کھو گئی ہے۔“(۴۲)

ناصر کی شاعری میں رات کا استعارہ بڑی فنی چابک دستی سے استعمال کیا گیا ہے ان کی مکمل شاعری میں رات کا استعارہ استعمال ہوا ہے۔ رات حقیقت میں زوال کی علامت ہے اور قوموں کے زوال کی وجوہات اور مسائل کی وجوہات کو بیان کرتی ہے:

آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گل
آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں
ہم سے تھی رونق کا شانۂ گل
ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل
ہم ہی گلشن کے امیں ہیں ناصرؔ
ہم سا کوئی نہیں بیگانۂ گل(۴۳)

ناصرؔ نے جب پاکستان میں حالات کو بدلتے دیکھا اور سیاست دانوں کے بدلتے رنگ و

روپ دیکھے تو وہ مایوس ہو گئے جس ملک کی خاطر انہوں نے قربانیاں دیں تھیں وہ اُن کو رائیگاں نظر آنے لگی۔ مفاد پرست طبقے نے بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے اور دولت اکٹھی کی مگر جنہوں نے جان ومال کی قربانیاں دیں تھی وہ محض خواب سہانے دیکھتے رہ گئے

ناصر جب حال کا مشاہدہ کرتے تھے تو ان کو ماضی یاد آتا تھا۔ڈاکٹر وزیر آغا ناصر کاظمی کی شاعری میں یاد ماضی اور یاد کے استعارہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ”ناصر کا کلام پڑھیں تو پہلی قرات میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نوسٹلجیا کا مریض ہے۔ دوسری قرات یہ بات سمجھاتی ہے کہ ناسٹلجیا نہیں بل کہ زندگی کے پُر اسرار دروازے کو کھولنے کی ایک کوشش ہے جسے ناصر نے ساتواں در کا نام دیا ہے۔ تیسری قرات میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی کے لیے یاد وہ برق خیال ہے جو ساتویں در کو توڑ کر داخل ہوتی ہے اور محب ہجراں کی تاریکی میں چمک سی پیدا کر دیتی ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو یاد وہ کلید ہے جس سے ناصر نے اپنے سونے مکان کے زنگ آلود تالے کھولتا ہے۔ یا وہی اُسے ماحول کی چپ اور دل کی ویرانی سے نجات دلاتی ہے۔ یاد ہی اس کے تخیل کو متحرک کر کے اُسے تخلیقی سطح پر منتقل کر دیتی ہے۔ اگر یاد کی فسٹ ناصر کا سائی پر رہتی تو اس کا تن ہی نہیں من بھی کسی خستہ حال مشین کی طرح پک ہلکانے لگتا اور شعر کہنے کی سکت ہی سے محروم ہو جاتا۔“(۴۴)

قیامِ پاکستان کے انسان ہی انسان کے خون کا پیاسا بن گیا اور انسانی اقدار پامال ہو گئیں۔ ہر شے بدل گئی وہ رونقیں وہ بے فکری کی زندگی وہ خوشیاں وہ خوش گپیاں اور آپس میں پیار محبت سب بدل گیا اور ہر کسی کو روز گار کے غم نے نڈھال کر دیا۔ انسانی آنکھوں میں پہلے سی روشنی ختم ہو گئی اور بے نور آنکھوں میں تازگی بھی نہ رہی اور انسانی اقدار کا جنازہ سرِ عام اٹھنے لگا۔

ناصر کاظمی حساس طبیعت کے مالک تھے اور وہ معاشرتی عدم توازن اور معاشرتی فسادات کو باریک بینی سے دیکھنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایسا گھر ہو جس کی دیواریں اگر چہ نہ ہوں مگر اُس کے لٹنے کا خوف بھی نہ ہو مگر ایسے معاشرے میں ایسا کیسے ممکن تھا ہر انسان مصروف

تھااور اُسے بس روز گار کی فکر تھی اور اسے کسی دوسرے انسان کے جذبات واحساسات کی کوئی پرواہ نہ تھی کیوں کہ انسان نے حیوان کا روپ دھار لیا تھا اور اسے کسی قسم کا کوئی احساس نہ تھا:

دیوانگی شوق کو یہ دھن ہے ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے در و دیوار سا بھی ہو
جز دل کوئی مکان نہیں دہر میں جہاں
رہزن کا خوف بھی نہ رہے در کھلا بھی ہو
ہر ذرہ ایک محمل عبرت ہے دشت کا
لیکن کسے دکھاؤں کوئی دیکھتا بھی ہو(۴۵)

یہاں اک شہر تھا شہر نگاراں
نہ چھوڑی وقت نے اُس کی نشانی
بتا اے ظلمتِ صحرائے امکاں
کہاں ہو گا مرے خوابوں کا ثانی
نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصرؔ
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی(۴۶)

ناصرؔ کاظمی نے معاشرتی مسائل اور معاشرتی حقائق سے پردہ اٹھایا اور ان مسائل کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ان کے نزدیک مسائل خود بہ خود جنم نہیں لیتے بل کہ معاشرہ ہی مسائل کا ذمہ دار ہے۔ وہ کہتے ہیں جہاں انسان اپنے اور پرائے میں فرق بھول جائے وہاں مسائل خود بہ خود جنم لیتے ہیں اور انسانی اقدار کی پامالی انسانی اقدار کو کھوہ دیتی ہے اور انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی ایسے امر کرے جس سے اُس کو حق ملے۔ انسانوں کے انسانوں پر مظالم کسی معاشرے کی ترقی وخوش حالی کو روک سکتے ہیں اور انسان مایوسی کا پرستار بن جاتا ہے اور یاس اور ناامیدی کی تاریک اس قدر زور پکڑ لیتی ہے کہ مسائل کی زد میں آ کر انسان اپنا وجود کھوہ بیٹھتا ہے اور اُس کو اپنی عزتِ نفس کا کچھ خیال نہیں رہتا ہے اور وہ ہمیشہ یاس اور ناامیدی کی تصویروں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اداسی بال کھولے سو رہی ہے(۴۷)

یہ آج کون سے طوفاں میں ہے سفینۂ دل
کہ دور دور کنارے نظر نہیں آتے
ہجوم یاس ہے اور منزلوں اندھیرا ہے
وہ رات ہے کہ ستارے نظر نہیں آتے(۴۸)

دکھوں، تکلیفوں اور غموں کا ستایا ہوا انسان آخر کب تک معاشرے کے مظالم کو برداشت کر سکتا ہے۔ انسان تو انسان ہے اس میں کون سا دیو مالائی خصوصیات ہوتی ہیں۔ یا انسان فرشتہ تو نہیں جس کو موت نہیں آتی۔ دکھوں کا لبادہ اوڑھے اور لوگوں کے مسائل بیان کرتے کرتے ناصر کاظمی آخر کار سرطان کے مرض کی لپیٹ میں آ گئے مگر کبھی کسی سے نہ کہا کیوں کہ ان کا مقصد صرف انسانی مسائل اور امنگوں کی ترجمانی کرنی تھی اور ان مسائل کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا تھا۔ بالآخر ۲ مارچ ۱۹۷۲ء کی صبح ناصر نے اپنی نیندیں پوری کرنے کی ٹھان لی اور ایسے نیند سوئے کہ پھر نہ اُٹھ سکے کیوں کہ دوبارہ جگانے اور اٹھانے کا اختیار تو قادرِ مطلق کے پاس ہے۔

ناصر کاظمی ایسی نیند سوئے کہ پھر دوبارہ نہ جاگ سکے اور درد اور دکھوں کا سمندر اپنے ساتھ بہا لے گئے۔ ان کے خیالات اور خوابوں کو محض خواب سمجھنے والے ان کی زندگی میں تو ان کی قدر نہ کر سکے، مگر جب ان کو ناصر کے خوابوں تک رسائی حاصل ہوئی تو وہ اُسے کو تلاش کرنے لگے مگر ان جیسا عظیم انسان پھر کہاں سے ملتا اور وہ سب ہاتھ ملتے رہ گئے:

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر
سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا
مجھے تو حیران کر گیا وہ
وہ رات کا بے نوا مسافر
وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصرؔ

تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا
پھر نہ جانے کدھر گیا وہ[۴۹]

حوالہ جات

۱۔ احمد عقیل ادبی:''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' دی پر فیکشنسٹس، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۰

۲۔ ڈاکٹر حسن رضوی:''وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء

۳۔ ثمینہ ندیم:''پاکستان میں اردو غزل ایک حسیاتی مطالعہ'' قرطاس، فیصل آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۷

۴۔ ناصر کاظمی:''برگ نے'' القا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۷

۵۔ ناصر کاظمی:''ڈائری نمبر ا''

۶۔ شیخ منیر احمد:''ہجر کی رات کا ستارا'' (مرتبہ) احمد مشتاق، ص ۲۵

۷۔ ڈاکٹر عنصر کاظمی:''انٹرویو حسن رضوی'' ۳ مارچ ۱۹۹۳ء

۸۔ انتظار حسین:''ہجر کی رات کا ستارا'' (مرتبہ) احمد مشتاق، ص ۶۸۔۶۹

۹۔ فرزانہ سید:''نقوش ادب'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۴۶۰

۱۰۔ ناصر کاظمی:''برگ نے'' ص ۲۰۔۲۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۔۸

۱۲۔ ثمینہ ندیم:''پاکستان میں اردو غزل ایک حسیاتی مطالعہ'' ص ۱۲۷

۱۳۔ ناصر کاظمی:''برگ نے'' ص ۷۶

۱۴۔ ڈاکٹر انور صابر:''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقاء'' مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۳۳

۱۵۔ احمد عقیل روبی:''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' ص ۱۲۹

۱۶۔ ناصر کاظمی:''برگ نے'' ص ۲۹۔۳۰

۱۷۔ ناصر کاظمی:''دیوان'' القا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۳۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۸۷۔۸۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۰۱۔۲۰۲

۲۰۔ سلیم احمد:''نئی دنیا کا مسافر، ہجر کی رات کا ستارہ'' (مرتبہ) احمد مشتاق، ۱۹۷۳ء، ص ۹۶

۲۱۔ ناصر کاظمی: ''برگ نے''ص ۱۴۱

۲۲۔ ناصر کاظمی: ''دیوان''ص ۹

۲۳۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی: ''جدید شاعری''اردو دنیا، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۵۰۲

۲۴۔ آفتاب احمد: ''ہجر کی رات کا ستارا''(مرتبہ) احمد مشتاق، ص ۱۲۰

۲۵۔ ناصر کاظمی: ''نشاط خواب''جہانگیر بک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴

۲۶۔ ڈاکٹر حسن رضوی: ''وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر''ص ۱۰۸

۲۷۔ ناصر کاظمی: ''نشاطِ خواب''ص ۱۹۔۲۰

۲۸۔ ناصر کاظمی، ''برگ نے''ص ۱۲۹

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۷

۳۰۔ ناصر کاظمی: ''دیوان''ص ۱۳۹۔۱۴۰

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۴۵۔۱۴۴

۳۲۔ ڈاکٹر احمد فاروق مشہدی: ''اجنبی مسافر، اداس شاعر''بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۱ء، ص ۹۰

۳۳۔ ڈاکٹر ساجد امجد: ''اُردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات''الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۵۱۱

۳۴۔ ناصر کاظمی: ''برگ نے''ص: ۳۴۔۳۳

۳۵۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی: ''جدید شاعری''ص ۵۰۵۔۵۰۴

۳۶۔ ناصر کاظمی: ''برگ نے''ص ۵۳۔۵۲

۳۷۔ ناصر کاظمی: ''دیوان''ص ۱۷۷

۳۸۔ مطلوب حسین: ''اردو غزل میں حزنیہ عناصر''لائل پور پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۲۴۵

۳۹۔ سجاد باقر رضوی: ''پگلے کی پیغمبری''(مشمولہ) لفظ، جنوری ۱۹۷۴ء، ص ۱۹

۴۰۔ ناصر کاظمی: ''برگ نے''ص ۱۸۶

۴۱۔ ناصر کاظمی: ''نشاطِ خواب''ص ۲۰۔۱۹

۴۲۔ احمد مشتاق: ''ہجرت کی رات کا ستارہ''ادارہ، لاہور، ص ۹۸۔۹۷

۴۳۔ ناصر کاظمی: ''برگ نے''ص ۱۲۲

۴۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا: ''کچھ ناصر کاظمی کے بارے میں''(مرتبہ) تنویر الرحمٰن، ناصر کاظمی کا شہر غزل، اسلامک

بک سنٹر، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۴۶

۴۵۔ ناصر کاظمی: "دیوان" ص ۲

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۴۔۱۵۔۱۶

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۱

۴۸۔ ناصر کاظمی: "برگ نے" ص ۱۸۲

۴۹۔ ناصر کاظمی: "دیوان" ص ۱۹۶۔۱۹۸

ساغر صدیقی کی شاعری سماجی مسائل کی عکاس

محمد اختر نام تھا اور قلمی نام ساغر صدیقی تھی۔ ابتدا میں ساغر ناصر حجازی تخلص استعمال کرتے تھے۔ مگر بعض نامساعد حالات کی وجہ سے انہوں نے ناصر حجازی تخلص ترک کر دیا اور ساغر صدیقی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مؤرخین اور محققین نے ان کے متعلق کوئی واضح کام نہیں کیا ہے اور ان کے دور کے بڑے بڑے نقادوں نے بھی اُن پر قلم نہیں اٹھایا اور ان کے والدین کے اسم گرامی کے بارے میں کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا وہ خود کہتے ہیں کہ ماں کی مامتا، باپ کی رفاقت اور کہاں پیدا ہوا ہوں یہ سب میرے لیے علی بابا چالیس چور کی پُراسرار کہانی کی طرح ہیں۔ دورِ جدید کی تحقیق بھی خاموشی کے مناظر دکھاتی ہے اور ساغر کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ان کے والد کا نام سلطان احمد تھا۔ بعض محققین کے نزدیک سلطان محمد اور کچھ لوگوں کے بہ قول محمد سلطان تھا۔ جو قیام پاکستان کے بعد لاہور میں گھوڑوں کی کُھریاں بنانے والی دکان پر کام کرتے تھے۔ ان کی والدہ محترمہ کا نام سکینہ بی بی تھا اور بعض لوگوں کے بہ قول بی بی تھا البتہ وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی والدہ کا نام سکینہ بی بی تھا یا صرف بی بی تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ساغر والدین کی اکلوتی اولاد تھے اور ان کا کوئی بھائی بہن نہ تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حبیب حسن خاں سے حاصل کی تھی جو اس وقت امرتسر میں مقیم تھے۔ ساغر کے گھر میں پنجابی زبان بولی جاتی تھی اور ان کو پنجابی اور اردو دونوں زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ ساغر صدیقی نے ساری عمر شاعری کی مگر بہت کم شعری مجموعے شائع ہو سکے بعض غزلیں اور اشعار غربت کی نظر بھی ہوئے۔ مگر جو شائع ہوتے ان میں ''زہر آرزو''، ''شیشۂ دل''، ''نغمۂ بہار''، ''سبز گنبد'' اور ''لوح جنوں'' شامل ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی قبرستانوں اور سڑکوں پر گزاری اور آوارگی کو اپنا لبادہ بنایا۔ آخر کار دیوانگی کے عالم میں بل کہ یوں کہیے کہ عالم مدہوشی میں ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء کی صبح کو دارِ فانی سے کوچ کیا۔ ان کی آخری سانس داتا دربار کے سامنے فٹ پاتھ پر نکلی لاوارثوں کی طرح سڑک پر پڑے رہے۔ آخر کار دوستوں نے خدا ترسی کی اور ساغر صدیقی کو میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

ساغر صدیقی کی شاعری میں سماجی مسائل، رومانویت، بے بسی، معاشرتی عدم توازن، ہجرت و فسادات اور حسن پرستی اور جمالیات جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ان کی شاعری کے موضوعات کو سمجھنے اور ان پر تحقیق کرنے سے پہلے ان کی ابتدائی زندگی اور حالات و واقعات سے آگاہی ضروری ہے۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقات میں اس کے ماحول کو بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ لہذا ساغر صدیقی کی شاعری پر تحقیق اور بحث کرنے سے پہلے ان کی زندگی کے مختلف پہلوئوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کیوں کہ ذاتی حالات وواقعات کسی بھی شخص کی ذہنی تربیت کا وسیلہ بنتے ہیں۔ لہذا ان واقعات کو سمجھے اور جانچے بغیر ساغر صدیقی کی شاعری پر بات کرنا ظلم عظیم ہوگا اور ایک بڑے شاعر کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ لہذا انہی خطوط پر چلتے ہوئے تحقیق کی منزلیں سر کرنا ہوں گی۔

خاندانی پس منظر

ساغر صدیقی کے آباؤ اجداد ہجرت کر کے ہندستان آئے تھے۔ مسلمانوں نے جب ہندوستان پر مختلف اوقات میں حملے کیے تو بہت سارے مسلمانوں نے لوگوں سے میل جول بڑھایا اور بعض لوگوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کی اور ایک نئی نسل وجود میں آئی۔ ساغر کے والدین انبالہ کے رہنے والے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد بھی ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے جو ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے ان کا گھرانہ مذہبی گھرانہ تھا۔ ان کی والدہ نیک سیرت اور پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ جس نے ساغر کی تربیت دینی اصولوں کے مطابق کی۔ مگر ساغر نے دین و دنیا سے لاتعلقی کا اظہار کیا جو تادم آخر رہا۔ تاریخ کی کتابوں میں ساغر کے متعلق کچھ نہیں لکھا گیا۔ بڑے بڑے مؤرخین نے ساغر کے حوالے سے سرد مہری سے کام لیا ہے مگر ڈاکٹر سلیم اختر نے ساغر کے متعلق کچھ معلومات فراہم کی ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں ساغر پر ایک پیراگراف لکھا ہے جو کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

ساغر خود بھی ساری ادبی حلقوں سے دور رہے اور بعض مفاد پرست ادیبوں اور شاعروں نے بھی ان کو ادبی حلقوں سے دور رکھا۔ ساغر کے والدین پڑھے لکھے تھے اور انہوں نے ساغر کی تربیت نہایت ایمان داری سے کی تھی۔ جس کا اندازہ ساغر کی شاعری سے لگایا جاسکتا ہے۔

بعض اوقات جب ان کے دوست ان سے والدین کے متعلق پوچھتے تھے تو وہ خاموشی کا دامن پکڑ لیتے تھے اور لمبی سانس لے کر آہ بھرتے تھے۔

بچپن میں ساغر اپنے والدین سے ناراض ہو کر امر تسر چلے گئے تھے جہاں ان کی ملاقات نہایت اور شفیق استاد حبیب حسن خاں سے ہوئی، جنہوں نے ان کی تعلیمی قابلیت کو جانچا اور پرکھا اور ان کو علم دوستی سے نوازا۔ ساغر کے بچپن کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں۔

ان کی شاعری کا عمیق نظری سے مطالعہ کیا جائے تو ان کی زندگی کے پوشیدہ حالات سے پردہ ہٹایا جا سکتا ہے۔ ساغر کی ذہانت کا اندازہ ان کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے کہ کس قدر وہ ذہین انسان تھے ہر وقت نشے میں دھت رہتے مگر، کمال کا لکھتے تھے۔ گھر میں حالات خراب تھے اور والدین کا کوئی خاص ذریعہ روزگار نہ تھا۔ اس لیے ساغر صدیقی میٹرک بھی مکمل نہ کر سکے اور چھٹی ساتویں تک پڑھے۔ امر تسر میں انہوں نے حبیب حسن خاں سے تعلیم حاصل کی جو قابل آدمی تھے مگر ان کی ذہانت غربت اور افلاس کے نیچے دب گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ساغر صدیقی کو رانی نامی ایک لڑکی سے عشق ہوا تھا اور ناکامی عشق کے بعد ساغر نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ اور انہوں نے امر تسر کا رخ کر لیا وہاں کئی دن خاک چھاننے کے بعد ایک دکان دار کے ہاں ملازم ہو گئے اور لکڑی کی بنی ہوئی کنگھیاں فروخت کرنے لگے۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ساغر حبیب حسن خاں کے گھر میں سوتے تھے، مگر یہ بات بھی یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ ساغر حبیب حسن خاں کے گھر سوتے تھے یا دوکان کے ایک کونے میں پڑے رہتے تھے۔ انہوں نے تقریباً پندرہ سال کی عمر میں اشعار کہنے شروع کر دیے تھے شروع شروع میں کچھ غزلیں ترنم کے ساتھ دکان پر اپنے گاہکوں کو سناتے تھے بعض تعریفیں کرتے تو بعض طنز کا نشانہ بناتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ ساغر کو شعر کہنے کا خاص ملکہ تھا، وہ اشعار اس منفرد انداز میں لکھتے اور پڑھتے تھے کہ سننے والے پر خوف طاری ہو جاتا تھا اور سننے والے کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی تھیں۔

ابتدائی دنوں میں ساغر کو لوگ ایک تماشا کرنے والا بچہ جمورا سمجھتے تھے اور حظ اٹھاتے تھے۔ ناکامئ عشق اور زمانے کی ستم ظریفی نے ساغر کی زندگی کو بڑا مشکل بنا دیا اور وہ صرف اور صرف دو وقت کی روٹی کے لیے دن بھر کام کرتے تھے اور رات کو پڑھتے تھے۔ ساغر کی ابتدائی اور آخری زندگی دونوں دکھوں کی آماج گاہ ہیں۔ ان کا بچپن انتہائی کسم پرسی اور مصائب سے بھرپور

تھااور وہ روز بروز حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہوتے گئے۔

شروع شروع میں انہوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر ظالم سماج نے اسے سنبھلنے نہ دیا، لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کو ایک راہ گزر کا فقیر سمجھتے تھے اور بعض تو بچہ سمجھ کے ہنس کے ٹال دیتے تھے۔ امرتسر میں گزرے ہوئے دن ساغر کی زندگی میں بڑے رجحانات لائے اور ان کی طبیعت میں شوخی جذبہ اور ہمت پیدا ہوگئی تھی مگر زمانے کی باتوں سے ان کے ارادے دھرے کے دھرے رہ جاتے تھے۔ وہ خود کی زندگی کو محض خوابوں کی بھیانک دنیا قرار دیتے تھے۔ بچپن میں گھر چھوڑنا پڑا اور پھر در در کی ٹھوکریں کھانا اور زمانے کے بدلتے رجحانات سے آشنائی حاصل کرنا، ان سب چیزوں نے ان کی زندگی میں کئی طرح کے عذاب پیدا کیے۔ مگر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ساغر کی شاعری میں سماجی مسائل کی موجودگی ان کی زندگی میں درپیش مسائل ہی ہیں۔

ساغر نے ہمیشہ زندگی کو خدا کی امانت سمجھا اور ہنس کر یا رو کر گزاری۔ امرتسر میں ساغر نے شاعری میں نام کمایا تھا مگر یہاں یہ بات بھی وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ ساغر کو کب شہرت ملی اور کیسے ملی؟۔ البتہ چند واقعات پر اتفاق کیا جاسکتا ہے اور ان کو مدِ نظر رکھ کر اصل واقعات تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ ساغر کو مذاقاً ٹاؤن ہال کے مشاعرے میں مدعو کر لیا گیا تھا۔ اور بڑے بڑے شعرا نے اس بچے کا مذاق اڑانے کی خاطر ساغر کو پہلے شعر پڑھنے کے لیے کہا تو ساغر فوراً آمادہ ہو گئے۔ اصل میں لوگ اور بڑے بڑے شعرا ساغر کی شاعری پر طنز کرنا چاہتے تھے، مگر جب ساغر نے اپنی غزل ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کی تو لوگوں نے خوب داد کے ڈونگرے برسائے اور ہر طرف واہ واہ کی آوازیں آنے لگیں، اور پھر اس کے بعد لوگوں نے ساغر صدیقی سے تین غزلیں سنیں اور اس کے بعد ساغر صدیقی امرتسر میں بڑے شاعر کے طور پر مشہور ہو گئے:

زندگی رقص میں ہے جھومتی ناگن کی طرح
دل کے ارمان میں بجتی ہوئی جانجھن کی طرح
زلف رخسار پر بل کھاتی ہوئی کیا کہنا
اک گھٹا چھائی ہوئی چیت میں ساون کی طرح

بحر امید میں جب کوئی سہارا نہ ملا
میں نے ہر موج کو دیکھا ترے دامن کی طرح
جس طرف دیکھیے ٹوٹے ہوئے پیمانے میں
اب تو نغمات بھی ہوں نالۂ شیون کی طرح
بار ہا گردش تقدیر کا عالم دیکھا
گیسوئے یار کی بے نام سی الجھن کی طرح
انقلابات بہاراں میں قفس بھی ساغر
میں نے جلتے ہوئے دیکھا ہے نشیمن کی طرح[۱]

مشاغلِ ساغر

ساغر صدیقی کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں، مگر جو معلومات ملتی ہیں ان پر مکمل اکتفا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہر غریب سے غریب تر انسان بچپن میں امیر ہوتا ہے۔ اس کی دنیا الگ ہوتی ہے وہ اپنی دنیا کا خود بادشاہ ہوتا ہے۔ ساغر کا بچپن بھی نہایت امیری میں گزرا مگر ناکامیٔ عشق نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کیا۔ ساغر کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن میں لٹو کے ساتھ کھیلتے تھے بعض لوگوں کے نزدیک وہ گُلی ڈنڈا بھی کھیلتے تھے، مگر وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ساغر بچپن میں گُلی ڈنڈا بھی کھیلتے تھے۔ البتہ دستیاب شدہ معلومات پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس دور میں پتنگ بازی اور گُلی ڈنڈا کھیلنا ایک رواج تھا لہٰذا ساغر بھی گُلی ڈنڈا کھیلتے ہوں گے۔ کیوں انسان جس معاشرے میں رہ رہا ہوتا ہے اس معاشرے کے حالات واقعات سے آگاہ ہوتا ہے اور اس معاشرے کے اثرات قبول کرتا ہے۔ لہٰذا ساغر نے بھی اپنے معاشرے کے اثرات قبول کیے ہوں گے۔

ساغر ابتدا ہی سے ذہین تھے۔ اس کی وجہ ان کے والدین کی تربیت تھی۔ ان کے استاد حبیب حسن خاں نے ان کی تعلیمی و تربیت میں کوئی سُقم باقی نہیں چھوڑا تھا۔ اور اپنی اولاد کی طرح ان کی تربیت کی تھی۔ ان کو موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ اور وہ موسیقی سے بڑا عشق کرتے تھے۔

ساغر ابتدائی دور میں اشعار گا کر پڑھتے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ساغر نے جو ترانہ

پاکستان کے لیے لکھا تھا اسے ساغر نے وادی کشمیر میں خود گایا تھا۔ ساغر نے ۱۵ پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ ابتدا ہی میں اشعار میں چاشنی اور ندرت خیال جیسے مضامین کو شامل کر لیا تھا۔ ساغر جس دکان پر کام کرتے تھے وہاں وہ لوگوں کو اشعار گا کر سناتے تھے اور لوگ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مگر ساغر نے شاعری ترک نہیں کی اور شاعری کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا اور با قاعدگی کے ساتھ اشعار لکھنا اور کہنا شروع کیے، جب تفریح کے لیے ساغر کو ٹاؤن ہال امرتسر میں مشاعرے میں بلایا گیا تو ساغر نے اپنی غزل کے چند اشعار ترنم کے ساتھ پڑے تو ہر طرف سے داد دی گئی اور راتوں رات ساغر ایک بڑے شاعر کے طور پر مشہور ہو گئے۔ اس کے بعد ساغر نے لطیف گرداسپوری جو اس وقت کے بڑے شعرا میں سے تھے۔ ان سے با قاعدہ اصلاح لینی شروع کی۔ ساغر کو شاعری سے عشق ہو تا گیا اور ان کا مشغلہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا اور وجہ شہرت بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ساغر نے ناریشن کمار اور ساحر لدھیانوی کے ساتھ بھی مشاعرے پڑے۔ مگر کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ ساغر کے بہ قول وہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ساغر نے شاعری اور موسیقی دونوں کا دامن پکڑا اور تادم آخر پکڑے رکھا وہ بڑے موسیقار تو نہ بن سکے البتہ ایک بڑے شاعر بن گئے ایسا شاعر جن کے برابر کا کوئی شاعر نہیں ہے۔

ساغر کو مناظر فطرت سے بڑی محبت اور عقیدت تھی وہ قدرت کی تمام چیزوں سے محبت کرتے تھے مگر ان کا فطرت سے ہم آہنگی اور رغبت قیام پاکستان سے پہلے کی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد تو ساغر خود میں غرق ہو گئے تھے۔ ساغر کو سیر و سیاحت سے خاصی دل چسپی تھی مگر ان کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ سیر و سیاحت کرتے البتہ چند مشاعروں میں شرکت کرنے کے لیے قریبی اضلاع میں چلے جاتے تھے اور دوران سفر مناظر فطرت سے حظ اٹھاتے تھے اور پھولوں کے ساتھ دیر تک باتیں کرتے تھے۔ اور ان حسین پھولوں کے خوشبو سے حظ اٹھاتے تھے، وہ باغوں کی سیر و تفریح کرتے تھے اور اشعار کہے جاتے تھے اور اگر کوئی راستے میں ستم گر مل جاتا تھا تو اسے روک کر اپنے دل کی بات سناتے تھے، اور اپنے محبوب کی باتیں پھولوں سے کرتے تھے، اور پھولوں کے جذبات کو اپنے لفظوں کا لبادہ پہنا کر بیان کرتے ہیں۔ مشتے از خروارے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بات پھولوں کی سنا کرتے تھے
ہم کبھی شعر کہا کرتے تھے
بکھری بکھری ہوئی زلفوں والے
قافلے روک لیا کرتے تھے
آج گلشن میں شگوفے ساغرؔ
شکوہ بادہ صبا کرتے تھے(۲)

تمہارے دامن رنگیں کا آسرا لے کر
چمن کے مست نظاروں سے کھیل سکتا ہوں
مجھے خزاں کے بگولے سلام کرتے ہیں
حیا فروش چناروں سے کھیل سکتا ہوں(۳)

مرے چمن میں بہاروں کے پھول مہکیں گے
مجھے یقین ہے شراروں کے پھول مہکیں گے
کبھی تو دیدہ نرگس میں روشنی ہو گی
کبھی تو اُجڑے دیاروں کے پھول مہکیں گے
تمہاری زلف پریشان کی آبرو کے لیے
کئی ادا سے چناروں کے پھول مہکیں گے(۴)

مناظر فطرت سے کھیلنا اور پھولوں سے باتیں کرنا اور حسنِ جمالیات سے متاثر ہونا ساغر کا شیوہ تھا اور وہ مناظر فطرت سے حظ اٹھاتے اور حسین پھولوں کو دیکھ کا غم دنیا کو کم کرتے تھے وہ پھولوں کی بات کو کانٹوں سے نہیں کرتے تھے بل کہ پریشان ہو جاتے اور مسائل کی زد میں رہ جاتے تھے تو مایوس نہیں ہوتے تھے بل کہ امید رکھتے تھے کہ ان کے چمن میں ضرور پھول کھلیں گے اور ان کا چمن پھر سے پھولوں کی زینت بنے گا اور ہر طرف خوشبوئیں بکھر جائیں گی۔ ساغر کو مناظر فطرت سے عقیدت تھی اور وہ چمن کے اجڑنے پر غم مناتے تھے اور وہ امید رکھتے تھے کہ ان کا چمن

پھر سے کِھل اٹھے گا اور حسین پھول ہوا کو خوشبو میں تبدیل کریں:

ساغر صدیقی کے مشاغل، گلی ڈنڈا کھیلنا، شعر گوئی اور مناظرِ فطرت سے محبت اور سیر و تفریح نے ان کی شاعری میں جدتِ ادا پیدا کر دی ہے۔ اور ان کی شاعری میں موضوعات کو تقویت عطا کی ہے۔ اوران کی ذہنی نشو و نما اور تربیت میں اہم کردار ادا کیا ہے، لہٰذا ان کی شاعری کے ہر موضوع میں نیا رنگ نیا ڈھنگ شامل ہے۔

زمانے کی ناقدری کا احساس

اچھوں کو برا کہنے کی روایت حضرت آدم سے چلی آرہی ہے۔ اور ہم ہر کسی کو اس ناقدری کا احساس رہتا ہے کہ اسے برا کیوں کہا گیا ہے۔ کیوں کہ ہر شخص پیدائشی طور پر برا نہیں ہوتا بل کہ حالات اسے برا بنا دیتے ہیں۔ ہر عہد میں شاعروں ادیبوں کو اپنی ناقدری کا احساس رہا ہے اوران کے فن کا بیشتر حصہ اس ناقدری اور احساس کمتری کے مضامین کا احاطہ کرتا ہے۔ معاشرتی عدم توازن ہمیشہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور انسان برے حالات سے مایوس بھی ہو جاتا ہے اور اس کے جذبات بھی کافی حد تک مجروح ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں تخلیق ہونے والا ادب غم و حزن کا تاثر دیتا ہے اور اس میں معاشرتی مسائل اور غم شامل ہو جاتے ہیں۔ شاعر معاشرتی مسائل کو اپنے مسائل سمجھنے لگتا ہے اور ان کو اپنی زندگی کا حصہ بنا کر صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا ہے۔

یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اچھے وقتوں میں دوستوں میں اضافہ ہوتا ہے مگر جب حالات اپنی ستم ظریفی پر اُترتے ہیں تو دوستی کے پہاڑ مسمار ہو جاتے ہیں اور وہ نظریں پھیر لیتے ہیں اور اس طرح غائب ہو جاتے ہیں کہ جیسے گدھے کے سر سے سینگھ۔ اچھے حالات کے دوست برے وقت میں بھول جاتے ہیں اور پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ کہ کہیں کوئی مدد نہ کرنی پڑ جائے۔ دستورِ دنیا یہی ہے کہ اچھے وقت میں بہت سارے دوست قربت کا اظہار کرتے ہیں مگر برے حالات میں گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں، حالات بدل جاتے ہیں کیوں کہ وقت کے بدلنے میں دیر نہیں لگتی مگر دوستوں کا پتہ چل جاتا ہے۔

ساغر صدیقی کے ساتھ ماحول اور دوست احباب نے یہی سلوک روا رکھا۔ اچھے دنوں میں تو بہت سارے دوست ان سے فیض یاب ہوتے تھے مگر جب حالات نے پانسہ پلٹا سب مفاد

پرست ہو گئے اور ساغر صدیقی کو زمانے کے غم اکیلے سہنے کے لیے چھوڑ دیا مگر ساغر نے کبھی اف تک نہ کی۔ بعض دوستوں نے تو ان کی غزلیں اپنے نام سے چھپوائیں اور خوب شہرت حاصل کی۔ جب ساغر روزنامہ تصویر سے وابستہ تھے تو ۱۹۵۲ءمیں ان کی ملاقات ایک چرسی فوٹو گرافر سے ہوئی۔ البتہ ساغر خود بھی کمال کے فوٹو گرافر تھے۔ اس ملاقات کے بعد ساغر کو نشے کی لت پڑ گئی اور ساغر افیون کے بعد چرس کے عادی ہو گئے اور پھر ٹیکے لگانے لگے۔ ساغر نے بہت سارے گیت لکھے مگر ان کے دوست احباب نے ان کی شاعری سے خوب فائدہ اٹھایا اور ساغر کو نشے کی ادویات دیتے اور ساغر سے ان کا کلام لکھوا کر اپنے نام سے چھاپتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد ساغر کی غزلیں مختلف رسائل میں چھپنے لگی تھیں اور ان کو بڑی شہرت بھی مل چکی تھی البتہ شہرت اور غوغائے عام یقیناً کسی بھی آدمی کے لیے جوش دلانے اور مزید محنت کرنے کے لیے بڑی اکسیر چیز ہوتی ہے، مگر کیا کیا جائے یہ اس سے پیٹ کا دوزخ اور ضروریات کا سامان مہیا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

البتہ شاعری نے ان کو مشہور کر دیا مگر نشے نے بھی ان کو پس پشت ڈالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ایک طرف تو ساغر اپنے دوست احباب کے رویوں اور حالات کی ستم ظریفی سے زخم خوردہ تھے تو دوسری طرف وہ زمانہ تھا کہ جب ایوب خاں نے مارشل لاء لگا دیا تھا۔ معاشی، معاشرتی، سیاسی ،مذہبی اور سماجی تباہی و بربادی کا شکار ہر شخص تھا، بدلتے حالات نے ساغر پر کئی اثرات چھوڑے انہوں نے ان حالات اور واقعات پر قلم اٹھایا اور خوب آہ پکار کرتے رہے۔ ساغر ایک درویش صفت انسان تھے جس کا کسی کو بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔

صدرِ پاکستان ایوب خاں کے دور میں شاعروں ادیبوں پر کئی طرح کی پابندیاں لگیں اور کئی شاعر اور ادیب گرفتار بھی ہوئے مگر ساغر ایک دلبر داشتہ انسان اور درویش صفت انسان تھے وہ معاشرے میں جو بھی ستم دیکھتے تھے لکھ دیتے تھے۔ انہوں نے حاکم وقت کو طنز کا نشانہ بھی بنایا کیوں کہ ان کے نزدیک درویش کی کمائی لوٹنے والا حاکم وقت ہے۔ ساغر اپنی کمائی کے لٹنے کا سبب ایوب خاں کو سمجھتے تھے۔ وہ بلا خوف و خطر کہتے تھے:

برگشتۂ یزداں سے کچھ بھول بھول ہوئی ہے
جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی

بھول ہوئی ہے اس عہد کے سلطان سے کچھ
حوروں کی طلب اور مے و ساغر سے ہے نفرت
زاہد ترے عرفان سے کچھ بھول ہوئی ہے(۵)

انسان جب معاشرے سے کنارہ کر لیتا ہے تو وہ ایک نئی دنیا آباد کر لیتا ہے وہ اس کی اپنی دنیا ہوتی ہے جہاں کوئی غم دکھ اور تکلیف نہیں ہوتی، بل کہ سکھ کا گہرا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہوتا ہے۔ ساغر صدیقی کو وہ پذیرائی اور عزت نہ ملی جس کے وہ حقیقی حق دار تھے۔ ان کی اور ان کی شاعری کی قدر نہ کی گئی اور انہوں نے اس طرح غم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور اپنی الگ دنیا بسا لی۔ ساغر معاشرتی صورت حال کے باعث غم کے صحراؤں میں ایسے بھٹکے کہ ان کے اشعار معاشرتی و زمانی مسائل کا نوحہ بن گئے۔ وہ اس قدر رنجور ہو گئے کہ دوستوں کی نصیحت پر بھی ناراض ہو جاتے تھے۔

ساغر اپنے دوستوں سے خوب واقف تھے کہ وہ عیار ہیں اور مفاد پرست ہیں ان کی صحبت میں رسوائی ہے۔ ساغر صدیقی نے جب دنیا کے مسائل سے کنارا کر لیا تو انہوں نے دوستوں سے بھی ملنا ترک کر دیا اور احساس و فکر و نظر کے میخانے میں غرق ہوتے گئے اور دوستوں کو بھولتے گئے اور زمانے کے ناقدروں کی صحبت سے دور ہوتے گئے:

احساس کے میخانے میں کہاں اب فکر و نظر کی قندیلیں
آرام کی شدت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
کچھ حال کے اندھے ساتھی تھے کچھ ماضی کے عیار سجن
احباب کی چاہت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
اب اپنی حقیقت بھی ساغر کے بے ربط کہانی لگتی ہے
دنیا کی حقیقت کیا کہیے کچھ یادرہی کچھ بھول گئے(۶)

ساغر صدیقی اپنے دوستوں سے خوب واقف تھے اور حال کے اندھے ساتھیوں اور ماضی کے مکاروں کی چالوں سے آشنا تھے مگر وہ ان کے غیر متوازن رویوں کے باوجود اپنا دل صاف رکھتے تھے۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ماحول اور معاشرے نے ان کے ساتھ ظلم و ناانصافی کی ہے اور ان کے صبر و قرار چھین کر رکھ دیا اور اپنی خواہشات کو عمل جامہ پہنانے کے لیے ان کا قرار چھینا۔ احباب کو اپنی فکر تھی اور اپنی خواہشات کے پورے ہونے کا ارمان تھا مگر ساغر صدیقی آہ

وزاری نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے لبوں کو سی لیتے تھے اور اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ لیتے اور سب کچھ جاننے کے باوجود کبھی بھی کوئی بات زبان پر نہیں لاتے تھے اوراپنے احباب کی ستم ظریفیوں پر وہ ہمیشہ پردہ ڈالتے تھے اور ان کے عیب چھپانے میں مصروف رہتے تھے۔

ساغر نے اپنے تمام دکھ اور غم کی بنیاد اپنے دوستوں کو ٹھہرایا ہے۔ ان کے نزدیک وہ زمانے کے بدتر شخص ہیں جنھوں نے ان کو نشہ کی لت لگائی ہے۔ اور وہ جانتے ہیں کہ ان کو کبھی بھی سکھ اور چین نصیب نہیں ہو گا، کیوں کہ ان کے نزدیک محبوب اور احباب کے بگڑنے میں واضح فرق ہے وہ احباب کے بگڑنے سے خائف نظر آتے ہیں۔ جب کہ ساغر کو ان کا کوئی دوست نظر نہیں آتا۔ وہ زمانے کو دیکھ کر قہقہہ لگاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے دوست منافقت کی تمام حدوں کو پار کر جاتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ساتھ تمام انسانوں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ معاشرے میں ظلم و ستم کا ذمہ دار معاشرے کے افراد کو گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر شخص جو ظلم سہتا ہے اور احتجاج نہیں کرتا وہ بڑا ظالم ہے:

جب کبھی بچھڑا ہوا دوست ملا ہے کوئی
مجھ کو اخلاص عزیزاں پہ ہنسی آئی ہے
مجھ کو اک زہر کا چھلکا ہوا ساغر دے دو
مجھ کو اس دور کے انسان پہ ہنسی آئی ہے (۷)

اس قدر عشق موجب رسوائی بن گیا
میں آپ اپنے گھر کا تماشائی بن گیا
بزم وفا میں آپ سے اک پل کا سامنا
یاد آگیا تو عہد شناسائی بن گیا
بے ساختہ بکھر گئی جلووں کی کائنات
آئینہ ٹوٹ کر تری انگڑائی بن گیا (۸)

ساغر کی بربادی کا سبب جہاں دوست احباب بنے وہاں ان کے گھر والوں نے بھی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی اور ان کی زندگی میں دکھوں اور غموں کا پہاڑ گرایا۔ رانی نامی لڑکی سے عشق کا جب

چرچا ہوا تو ساغر صدیقی کو معاشرے میں رسوائی کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ گھر والوں نے بھی بے رخی کا اظہار کیا اور ساغر آخر کار دل برداشتہ ہو کر گھر چھوڑ گئے اور اپنے محبوب کی گلی میں کبھی لوٹ کے نہ آئے۔ ساغر نے عشق کو اپنے رسوائی اور بربادی کا موجب اس لیے قرار دیا ہے کہ وہ اس کی بدنامی کا سبب بنا۔ مگر عشق کی ناکامی نے ساغر کی شاعری اور زندگی میں نئی روح پھونک دی جس نے دونوں کو تادم آخر جواں رکھا:

کہا جاتا ہے کہ ساغر کا محبوب محض خیالی محبوب تھا وہ کوئی جیتا جاگتا محبوب نہ تھا جس کی اداؤں اور نازنخروں پر ساغر مرمٹ جاتے اور اپنی تمام تر خواہشات اور دل کے ارمان اسے سناتے، مگر بعض لوگوں کے نزدیک ساغر نے کسی لڑکی سے محبت نہیں کی ہے، البتہ کہیں نہ کہیں وہ کسی سے تخاطب کرتے نظر آتے ہیں:

آج روٹھے ہوئے ساجن کو بہت یاد کیا
اپنے اجڑے ہوئے گلشن کو بہت یاد کیا
جب کبھی گردش تقدیر نے گھیرا ہے ہمیں
گیسوئے یار کی الجھن کو بہت یاد کیا
شمع کی جوت پہ جلتے ہوئے پروانوں نے
اک تر سے شعلہ دامن کو بہت یاد کیا
جس کے ماتھے پہ نئی صبح کا جھومر ہو گا
ہم نے اس وقت کی دلہن کو بہت یاد کیا
آج ٹوٹے ہوئے سپنوں کی بہت یاد آئی
آج بیتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا
ہم سیر طور بھی مایوس تجلی ہی رہے
اس درِ یار کی چلمن کو بہت یاد کیا
مطمئن ہی ہو گئے دام و قفس میں ساغر
ہم اسیروں نے نشیمن کو بہت یاد کیا[۹]

ساغر کے محبوب کی مجسم تصویر ان اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے اور انہوں نے اس کے

ہونے کا احساس ہمیں دلایا ہے اور ان کا محبوب ان کے نزدیک ان کی پوری کائنات ہے۔ مگر بعض محققین کے یہ قول ساغر کا کوئی محبوب نہیں ہے۔ بہ قول فرزانہ جمالی:

"ساغر کی زندگی میں کوئی جیتا جاگتا، حسن کی ادائیں دکھاتا، محبوب تھا یا نہیں لیکن اس کے تصورات کسی پیکر سے آباد ضرور رہے۔ اس کی غزلوں میں وہ حسین پیکر پوری شدتوں کے ساتھ موجود رہا اور وہ اس کو یاد بھی کرتا رہا، اور اس سے تخاطب بھی کرتا رہا۔"(۱۰)

ساغر کی شخصیت غیر معمولی نوعیت کی نہ تھی نہ ہی انھوں نے باقاعدہ کسی جگہ سے تعلیم حاصل کی تھی البتہ چند کتابیں پڑھ رکھی تھیں، اور دنیاوی اعتبار سے ان کی زندگی کوئی خاص کام یاب نہ تھی۔ جب دوست احباب والدین محبوب سب تم ان پر ستم کیے تو وہ محرومیوں اور مایوسیوں کے دامن سے لپٹ گئے۔ انہوں نے ان محرومیوں سے چھٹکارا پانا چاہا، مگر زمانے کی ستم ظریفی نے اس کو اس گرداب میں قید رکھا اور خوشی اور آسودگی کی خواہش ان کی زندگی کا خاصا تھا۔ انہوں نے جب بھی مسرت و آسودگی کی خواہش ظاہر کی ان کو انتشار ملا اور وہ پکار اٹھے:

میں تلخئ حیات سے گھبرا کے پی گیا
غم کی سیاہ رات سے گھبرا کے پی گیا
اتنی دقیق شے کوئی کیسے سمجھ سکے
یزداں کے واقعات سے گھبرا کے پی گیا
چھلکے ہوئے تھے جام ، پریشان تھی ، زلف یار
کچھ ایسے حادثات سے گھبرا کے پی گیا
میں آدمی ہوں کوئی فرشتہ نہیں حضور
میں آج اپنی ذات سے گھبرا کے پی گیا
دنیائے حادثات ہے اک دردناک گیت
دنیا حادثات سے گھبرا کے پی گیا

کانٹے تو خیر کانٹے ہیں ان سے گلہ ہی کیا
پھولوں کی واردات سے گھبرا کے پی گیا
ساغرؔ وہ کہہ رہے تھے کہ پی لیجیے حضور
ان کی گزارشات سے گھبرا کے پی گیا(۱۱)

ساغر نے جب تمام حالات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تو انہوں نے مایوسی کا دامن پکڑا اور زمانے کی ستم ظریفی اور اپنوں کے مظالم اور ناروا سلوک کو بھلانے کے لیے شراب کا سہارا لیا۔ ہمیشہ محرومیاں اور مایوسیاں ان کے دامن سے لپٹی رہیں اور ساغر ان محرومیوں کا پہرہ دار بنا رہا۔ بہ قول فرزانہ جمالی:

> "ساغر صدیقی کی شخصیت غیر معمولی نہیں تھی نہ ہی باقاعدہ کسی جگہ سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ دنیاوی اعتبار سے ان کی زندگی بھی کامیاب نہیں رہی۔ محرومیاں اور مایوسیاں اس کے دامن سے لپٹی رہیں۔ زندگی کو اس نے روشن اور تاب ناک بنانا چاہا، مگر وہ تاریک ہوتی چلی گئی۔ اس کو ہمیشہ اُلجھن، پریشانیاں ملیں۔ مسرت و آسودگی کی خواہش میں اس کو صرف انتشار ملا۔"(۱۲)

ساغر صدیقی نے غم کو اپنا مستقل اوڑھنا بچھونا بنایا اور اسے زندگی کی ایک بڑی نعمت سمجھا۔ انہوں نے مفاد پرستوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور بے بسی اور مایوسی کے عالم میں خود آوارگی کا دامن پکڑ کر دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ساغر جانتے تھے کہ ان کی تکلیف سے اگر کسی کو خوشی نصیب ہوتی ہے تو ہونے دو کوئی بات نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کہ ارمان تو کبھی بھی پورے نہیں ہو سکتے البتہ کسی شخص کو ان کی وجہ سے فائدہ پہنچتا ہے تو یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ اسی حوالے سے مطلوب حسین اپنی کتاب "اردو غزل میں حزنیہ عناصر" میں رقم طراز ہیں:

> "غم کے مسلسل حملے انسان کو رنج سے خوگر کر دیتے ہیں۔ پھر وہ اسی میں ہی عافیت سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے اندر حزن کو سہنے کے لیے ایسی قوت جنم لیتی ہے جو اُسے اس بات پر اکساتی رہتی ہے۔ کہ تم تو اب آندھیوں کی زد پہ ہو ہی دکھ اور تکلیف دینے والوں کو تو ان کی حسرتیں پوری کر لینے دو تا کہ ان

کے دل کے ارمان تو نکل جائیں۔"(۱۳)

ساغر صدیقی کو زمانے کی ناقدری کا احساس ساری عمر رہا اور وہ اپنے غموں اور دکھوں سے کھیلتے رہے۔ وہ دوست احباب سے محبت کرتے رہے وہ جانتے تھے کہ اس زمانے میں فقیروں کا کوئی غم گسار نہیں ہے اسی لیے ان کو دل میں بسانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔لہٰذا چپ کا دامن تھام لیا جائے تو بہتر ہے:

ہم فقیروں کا اس زمانے میں
کون ہے غم گسار چپ ہو جا(۱۴)

ہجرت اور مسائل ہجرت اور معاشرتی تقسیم کے اسباب اور نقصانات

ہجرت کرنا سب سے بڑا سماجی المیہ ہے۔ یہ المیہ انسان کو اس وقت پیش آتا ہے جب وہ مجبوری کے تحت ہجرت کرتا ہے اور کچھ نامساعد حالات اسے ہجرت کرنے مجبور کرتے ہیں۔ انسان اپنی خوشی سے سیر و سیاحت کے واسطے، روزگار کے واسطے، یا تعلیم کے واسطے ہجرت کرے تو وہ ہجرت کئی طرح سے انسان کو حظ فراہم کرتی ہے۔ بعض اوقات انسان دوران ہجرت کئی طرح کی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے، مگر جب اسے مجبوری کے تحت ہجرت کرنا پڑ جائے تو اس کے لیے یہ ہجرت روز محشر سے کم نہیں ہوتی۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ خداوندِ عظیم نے انسان کو سفر میں برکت کا اشارہ دیا ہے۔ بزرگان دین کے نزدیک بھی سفر کرنا باعثِ برکت ہے۔ مگر مجبوری کے تحت ہجرت کرنا اور سفر کرنا باعث اذیت بن جاتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے دوران جو واقعات رونما ہوئے تاریخ کے سیاہ باب میں لکھے جائیں تو قباحت نہیں۔ ادھر ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہوا تو برسوں تک ایک ساتھ رہنے والے مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے اجنبی ہو گئے۔ بہ وقت تقسیم ہندوستان مسلمان اور ہندوؤں نے اپنے آباؤ اجداد کی وراثتوں، شہروں، گلی کوچوں، محلوں اور شہروں کو خیر باد کہا اور اجنبی شہروں، گلی کوچوں اور موسموں کو اپنانے کے لیے ہجرت کی۔

وہ ناچاہتے ہوئے بھی ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے کیوں کہ حالات نے ان کو اس قدر مجبور کر دیا کہ وہ بے بس ہو گئے اور اپنی اپنی منزلوں کی طرف چل پڑے۔ جہاں بہت سارے لوگ

دوران ہجرت پیش آنے والے واقعات سے پریشان اور بے چین ہوئے وہاں ایک شاعر جو کہ معاشرے کی آنکھ ہوتا ہے، اس کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ دورانِ ہجرت پیش آنے والے انتشار کی کسک اور بے تابی نے جہاں انسانی ذہنوں کو متاثر کیا وہاں شاعروں اور ادیبوں پر بھی اپنے دیر پا اثرات چھوڑے۔ ان واقعات اور حالات کی فضائیں اردو غزل کے سبھی شعرا کے ہاں سنائی دیتی ہیں:

> "تقسیم اور اس کے پیدا کیے ہوئے غیر معمولی انتشار نے ہمارے دل میں جو خلش اور بے تابی پیدا کی ہے اس کی کسک ہماری غزل میں بھی آئی ہے۔ اس کی غم انگیز صدائیں تقریباً سبھی غزل گو شعرا کے ہاں سنائی دیتی ہیں۔"(۱۵)

ساغر صدیقی جب ہجرت کر کے پاکستان آنے لگے تو انوں نے دوران، ہجرت پیش آنے والے حالات و واقعات کو دیکھا اور بڑے دل گرفتہ ہو کر ان واقعات سے جان چھڑائی مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں ان حالات کا تذکرہ ان کی شاعری میں مل جاتا ہے۔ ہجرت کی کسک وہ ہمیشہ محسوس کرتے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں کیا۔ اپنا گھر چھوڑ کر زادِ سفر اور کچھ نقدی ساتھ رکھنے کا حوصلہ ہوا کیوں کہ زیادہ رقم وبال جان بھی بن سکتی تھی، اس لیے کچھ نقدری رقم لی اور زادِ سفر شروع کیا۔

ساغر صدیقی جب شعر شروع کیا تو انوں نے دوران ہجرت پیش آنے والے واقعات کو گہری نظر سے دیکھا ان کے ہاں ہجرت کے دوران پیش آنے والے واقعات قدرے کم ملتے ہیں۔ مگر ان واقعات تک رسائی کے ذرائع بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ ساغر یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا یہ وہی اشرف المخلوقات ہے جس کو جن و ملائک نے سجدہ کیا تھا۔ ہاں نہیں ہیں اور اس طرح کے کئی خیالات نے ساغر کے دماغ پر اثرات مرتب کیے۔ کچھ لٹے پٹے قافلے جب سر زمین ہندوستان پہنچے تو ان کو کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، سب سے بڑا مسئلہ رہائش اور کھانے کا تھا۔ لوگوں کو کیمپوں میں رکھا گیا اور کچھ امدادی ٹیموں نے ان کی مدد کی۔ ساغر جب سر زمین پاکستان پہنچے تو انہوں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ یہاں پر ان کو بڑی پذیرائی ملی، اور کئی ہفت روزہ اخباروں میں ان کا کلام چھپنے لگا۔ مگر ساغر کی روح کو چین نہ آیا اور ساغر کو وہ لٹے پٹے قافلے اور لوگ یاد آنے لگے۔ ساغر بعض اوقات تو آنکھیں بند کر اپنی ماضی کو یاد کرتے تھے تو بعض اوقات ان مہاجرین کی حالتِ زار پر اشک فشانی کرتے۔

ساغر صدیقی نے پاکستان میں اپنے خیالات واحساسات کو عملی جامہ پہنانا چاہا مگر کچھ ظالم احباب نے ان کے احساسات و جذبات کو مجروح کیا اور ساغر کی معصومیت سادگی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ساغر ہمیشہ اپنے ماضی کو یاد کرتے اور اپنے اس گلشن کو یاد کرتے جس کو وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ اُسے یاد کرتے مگر جس خواب کی تکمیل کرنے ساغر پاکستان آئے تھے وہ محض ایک ادھورا خواب تھا جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ساغر ماضی کی رونقوں اور گھر کو بہت یاد کرتے تھے مگر وہ محض ایک کہانی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد بہت سی امیدیں خاک میں مل گئیں اور ساغر بلبلا اٹھے:

آج روٹھے ہوئے ساجن کو بہت یاد کیا
اپنے اجڑے ہوئے گلشن کو بہت یاد کیا
جس کے ماتھے پہ نئی صبح کا جھومر ہو گا
ہم نے اس وقت کی دلہن کو بہت یاد کیا
آج ٹوٹے ہوئے سپنوں کی بہت یاد آئی
آج بیتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا[۱۶]

قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کو بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، مسلمان جن خواہشات کو لیے پاکستان ہجرت کر کے آئے تھے وہ کبھی پوری نہ ہو سکیں، اور کئی مایوس انسان حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ابدی زندگی سے کنارہ کر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر انسان بہت سارے جذبات واحساسات کا مالک ہوتا ہے۔ مگر جس انسان کی تمام خوشیاں اور امیدیں چھین لی جائیں تو اس کے جذبات اور احساسات میں کیا تبدیلی وقوع پزیر ہو گی۔ بعض اوقات تو انسان زمانے کی ستم ظریفی سے تنگ آکر درندہ ہو جاتا ہے اور سماجی روایات اور رسم ورواج سے منہ موڑ لیتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دنیا کے رنگ برنگے محلات کو چھوڑ کر جھونپڑیوں کو اپنا نشیمن بنالیتا ہے۔

ساغر کہتے ہیں کہ مکان یعنی گھر انسان کو بہت سارے مسائل سے بچا لیتا ہے۔ انسان اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر ہو تو وہ معاشرے کی بہت ساری بدعات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ مگر جب انسان بے گھر ہو تو معاشرے کی برائی اس کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔ چاہے وہ کتنا بھی اس برائی سے اجتناب کرے۔ ہجرت کے بعد بہت سارے مہاجرین کو کیمپوں میں ٹھہرایا گیا اور ان کو

بہت ساری سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی مگر حالات کی گردش نے بہت ستم کیے اور بہت سارے لوگوں کو متاثر کیا۔

ساغر کہتے ہیں کہ قیام پاکستان کے وقت بہت سارے مفاد پرست طبقے نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے اور بہت ساری جائیدادیں ہتھیائیں۔ جن لوگوں کے پاس ہندوستان میں رہنے کو گھر نہ تھا انہوں نے پاکستان آکر کوٹھیوں پر قبضے کیے اور اپنے نام کئی جائیدادیں لگوائیں۔ مگر جن لوگوں نے پاکستان کے لیے بہت ساری قربانیاں دیں اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آئے کہ ان کی قربانیاں رنگ لائیں گی، مگر ان کے خیالات کے برعکس صورت حال تھی، کیوں کہ ان کے مقدر میں صرف اور صرف قربانیاں دینا لکھا تھا۔ ان کی قسمت میں کہاں لکھا تھا کہ ان کی خواہشات پوری ہوں گی۔ ان کو بھی گھر ملیں گے اور ان کے بچے گھر کی چھت تلے رہیں گے۔ مگر حالات کی ستم ظریفی نے ان پر بڑے ستم کیے اور ان کے مقدر میں صرف اور صرف جھونپڑے تھے۔ کیوں کہ ان کی قربانیوں کا ثمر مفاد پرست طبقے نے کھایا اور کئی محلات بنائے اور ان میں رنگ برنگے پھولوں کے اور پھلوں کے باغ لگوائے مگر غریب مہاجرین کی قسمت میں تو کیمپ ہی تھے۔ جہاں پر نہ کھانے کی اشیا تھیں اور نہ پینے کی، مگر امرا نے عیاشی کی زندگی شروع کی تو ساغر نے ان کو احساس دلایا کہ جھونپڑیوں میں بھی رہنے والے انسان ہیں وہ بھی آدم کی اولاد ہیں اور انہوں نے بھی کئی قربانیاں دی ہیں:

ایوانِ گلفشاں کے مکینو ذرا سنو!
ان جھونپڑیوں میں بھی کہیں فطرت کے پھول ہیں (۱۷)

دورانِ ہجرت جو بھی واقعات پیش آئے ان کو بیان کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ مگر بعض واقعات جن پر تاریخ بھی اشک بہاتی ہے وہ فساداتِ ہجرت ہیں۔ مسلمانوں نے جب سفر ہجرت شروع کیا تو بہت سارے ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر حملے کیے اور کئی مسلمانوں کو ان کے اپنوں کے سامنے قتل کیا گیا۔ ماں کے سامنے اس کے بیٹے کو قتل کیا جاتا اور بھائی کے سامنے اس کی بہن کی عصمت کا دیا بجھایا جاتا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا گلا کاٹ کر ان کو بازاروں میں پھینک دیا جاتا۔ بعض عورتوں کو اغوا بھی کیا گیا اور بعض مسلمان عورتوں کو ان کے اپنوں کے سامنے قتل کیا جاتا اور بعض اوقات تو انسانی صورت میں شیطان کا روپ دھار لیتا اور عصمتوں کے

دیے سر عام بجھاتا نظر آتا ہے۔ فسادات ہجرت کے حوالے سے مطلوب حسین رقم طراز ہیں:

> ”فساد کے واقعات کسی بھی پتھر دل کو رلا دینے کے لیے اپنے اندر بہت سی المیہ کہانیاں لیے ہوئے تھے یہ وہ وقت تھا کہ جب انسانیت منہ چھپائے ہوئے پھر رہی تھی اور شیطانیت سرِ بازار رقص کرتی نظر آتی تھی۔ جو عرصہ دراز سے اندر ہی اندر پلتی پلتی اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ اب اس کا کوئی توڑ ہی نہ تھا سوائے بے نقاب ہونے کے۔“(۱۸)

مسائل ہجرت نے جب انسان کی کمر توڑ دی تو وہ اس قدر مجبور ہو گیا کہ اس نے اپنی عزت نفس کو بھی داؤ پر لگا دیا اور بھوکے پیٹ کی خاطر سب کچھ بیچنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ فساداتِ ہجرت کے بعد امراء نے مہاجرین کی عصمت درازی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی اور بڑے بڑے امراء مہاجرین کیمپوں کا معائنہ کرتے اور ان کیمپوں میں موجود معصوم کلیوں کی عصمت درازی کرتے بعض مہاجرین جن کی عزتیں کافروں سے تو محفوظ رہیں نام کے مسلمانوں سے نہ بچ سکیں اور ان کی عصمتوں کو جنازہ مسلمانوں نے نکالا۔ مہاجر کیمپوں کے پہرہ داروں نے بھی اپنی ہوس کو کم کرنے کے لیے اپنے ضمیر کو روپوش کیا اور شیطانیت کا روپ دھارا، اور عصمتوں کی پامالی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ بعض مسلمان عورتوں کو بڑے بڑے امرا کی کوٹھیوں پر پکڑ کر لے جاتے اور شور شرابہ کرنے والے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

بعض مجبور انسان تو اپنی عزتوں کو بیچنے پر مجبور ہو گئے اور بعض کو مجبور کیا جاتا۔ بھوک افلاس نے انسان سے انسانیت چھینی اور شیطانیت کا لبادہ پہنایا۔ مفاد پرست طبقہ کے لوگ چند روپوں کے عوض ان کو بیچ دیتے اور بعض امیروں کو خوش کرنے کے لیے لڑکیوں کو اغوا کر لیا جاتا اور اپنی عیش عشرت کے سامان مہیا کرتے۔

مختصر یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جوتوں میں دال بٹنے لگی۔ ہر کوئی لوٹنے، مارنے میں مصروف ہو گیا اتفاق ختم ہو گیا اور مسائل نے خوشیوں کا گلہ گھونٹ دیا۔ انسان نے مسائل کے ہاتھوں اپنی شکست تسلیم کی اور حالات کے آگے گھٹنے ٹیک دیے:

اے دوست یہاں ویرانوں کو گلزار سمجھنا پڑتا ہے\
کچھ اونچی نیچی راہوں کو ہموار سمجھنا پڑتا ہے

احساس کے الٹے پاؤں سے جب چلتے چلتے تھک جائیں
تو راہ گزر کو اے راہی دیوار سمجھنا پڑتا ہے
جب شاہی قباؤں کی خاطر کچھ جسم برہنہ ہو جائیں
اُس وقت غلاموں کو ساغر مختار سمجھنا پڑتا ہے(۱۹)

بکی کس کی عصمت لٹی کس کی دنیا
تمھیں کیا تم اپنی دکانیں سجاؤ(۲۰)

تیری عصمت ہو کہ ہو مرے ہنر کی چاندنی
وقت کے بازار میں ہر چیز کے لگتے ہیں دام(۲۱)

ناکام زندگی انسان سے سب کچھ چھین لیتی ہے۔ عزت نفس، دولت، فقر، استغنا جو انسانی زندگی کا جزو ہیں۔ زندگی یہ تمام خصوصیات انسان سے چھین لیتی ہے اور جب ایک انسان بھوک کا شکار ہو تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس قدر گرا دیتا ہے کہ انسانیت دم توڑ جاتی ہے۔ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اپنی غیرت کا بھی سودا کر لیتا ہے۔ ہجرت کے بعد بعض انسانوں نے اپنے ضمیر کو بیچا اور حالات کی ستم ظریفی سے تنگ آ کر اپنی ساری ساکھ ختم کر دی۔ بعض لوگوں نے میکدے کو اپنا ٹھکانہ بنایا تو بعض قحبہ خانوں کی زینت بنے۔

مہاجر کیمپوں سے لڑکیوں کو اغوا کیا جاتا اور ان کو بازار میں منہ مانگے دام بیچا جاتا۔ آزادی جس کی خاطر مسلمانوں نے کئی قربانیاں دیں اس آزادی نے الٹا ان کو رسوئیاں دیں اور سوائے رسوائیوں کے ان ے حصہ میں کچھ نہ آیا اور مفاد پرست طبقے نے ان کی مجبوریوں سے ہمیشہ فائدہ اٹھایا اور ہمیشہ اٹھاتے رہیں گے:

آزادیوں کے نام پہ رسوائیاں ملیں
مشکل سے تیرے درد کی پہنائیاں ملیں(۲۲)

مسائل ہجرت میں سب سے بڑا مسئلہ خوراک اور مکان کا ہے۔ بھوک نے انسانوں سے انسانیت چھینی اور مکان کو ترسنے والے کیمپوں کی زینت بنے تمام فرد خواہشات جو مسلمانوں کے دل

میں تھیں پوری نہ ہو سکیں اور دل کے تمام زخم جن پر کھرنڈ آ گیا تھا پھر سے تازے ہو گئے اور غم نے زندگی کو اپنی گرفت میں لیا اور اسے مسائل کی دولت سے نواز دیا۔ ساغر نے اپنی غزلوں میں مسائل ہجرت کو بیان کیا اور زندگی کا شیرازہ لفظوں میں بیان کیا۔ انہوں نے لفظوں کے ذریعے انسانی احساسات و جذبات کو صفحہ قرطاس پر مستقل کیا اور اس وقت کے حالات کو من و عن بیان کیا اور مسائل ہجرت کو بیان کرنے میں کوئی سقم باقی نہ چھوڑا:

بند گر ہو نہ تیرا خمیازہ
بھوک ہے زندگی کا دروازہ
چارہ گر بانکپن مبارک ہو
زخم دل ہو گئے ترو تازہ
پوچھ لو!تربتوں کے کتبوں سے
دے رہی ہے حیات آوازہ
ساحل آرزد سے کرتے ہیں
حسرتوں کے بھنور کا اندازہ
چند غزلوں کے روپ میں ساغرؔ
پیش ہے زندگی کا شیرازہ[۲۳]

ساغر صدیقی کی شاعری کا اگر باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہجرت و فسادات کے کٹھن مراحل نے ساغر کی شاعری کو امر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ساغر نے فسادت ہجرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان یاداشتوں کو شعر کا جامہ پہنا کر شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا ہے اور ان کی شاعری ایک دبستان کو اپنے اندر ضم کیے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔

معاشرتی عدم توازن اور معاشرتی مسائل

معاشی سکون و اطمینان زندگی کی نعمت اور معاشی ناآسودگی زندگی کا بہت سنگین مسئلہ اور عذاب ہوتا ہے، کوئی بھی انسان بہت ساری خصوصیات مثلاً عقل مند، دانا، ہنر مند کا مالک ہو گا تو معاشرہ اس کی دانائی، عقل مندی اور اس کے ہنر کو آسانی کے ساتھ قبول نہیں کرے گا۔ یہ بات

روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب انسان کا پیٹ بھرا ہو گا تو اس کا ایمان بھی تازہ ہو گا یا یوں کہیے کہ خالی پیٹ والے کا ایمان اور خالی جیب والے کی عزت عظمت کا محفوظ رہنا کرامتِ عظیم ہے۔ ہر انسان معاشرتی مسائل کا شکار ہو تا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح سے مسائل کی زد میں آجاتا ہے۔ معاشرہ کا ہر مسئلہ ہر اُس شخص کا مسئلہ ہو تا ہے جو اُس معاشرے کا حصہ ہو تا ہے۔

ہر معاشرہ چاہے وہ کسی قدر ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ ہو وہ کسی نہ کسی مسئلہ کا شکار ہو تا ہے۔مسائل چاہے سماجی ہوں یا ذاتی نوعیت کے ہر شخص یا ہر فرد ان سے متاثر ہو تا ہے۔ انسان پیدائشی طور پر آزاد ہو تا ہے مگر زمانے کے رسم و قیود اور مسائل کی جکڑ اس سے آزادی چھین لیتی ہے اور اسے بھی ان عادات سے نواز دیتی ہے جو رائج الوقت ہوتی ہیں۔ کلاسیکی اردو شاعری میں سماجی مسائل پر بہت کم لکھا گیا تھا مگر جدید شاعری نے نئی کروٹ لی اور اس نے شاعری کو گل و بلبل کے نغموں تک محدود نہیں رکھا بل کہ ہر ذی روح کے مسائل پر بھی گہری روشنی ڈالی اور محبوب کی ستم ظریفیوں کو زمانے اور معاشرے کی ستم ظریفیوں میں ڈھال دیا ہے۔

اردو نظم کے علاوہ غزل نے بھی نئی جہات کو قبول کیا اور نت نئے موضوعات کو اپنا موضوع بحث بنایا مطلوب حسین کے بقول:

> ”جہاں تک غزل بیان کردہ موضوعات کے تعلق ہے تو اس حوالے سے یہ صف بڑی کشادہ دل ہے۔ معاملات حسن و عشق سے لے کر غم روزگار اور معاشرتی مسائل سے لے کر انفرادی مسائل فلسفہ و فکر سے لے کر تصوف اور وحدت الوجود سے لے کر شہود تک پاک بازی و پارسائی سے لے کر رندی و شاہد بازی کوئی اایساموضوع نہیں جو اس میں بیان نہ کیا جاتا ہو۔ اور پھر ہر موضوع میں اس کا رنگ جو نکھر کر سامنے آتا ہے کہ جیسے یہ صرف وہی مضمون کے بیان کرنے کے لیے مقرر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حزن والم کے بیان میں مرثیہ ، شہر آشوب، گیت یا کوئی دوسری صنف غزل سے ناصرف مات کھاتی نظر آتی ہے بل کہ اگر یہ کہا جائے کہ کانٹے کا مقابلہ بھی دیکھنے کو نہیں ملتا ہے اور غزل میدان مار لیتی ہے تو مبنی بر حقیقت ہو گا۔“(۲۴)

مطلوب حسین کی رائے کا موازنہ اگر ڈاکٹر انور صابر کی رائے سے کیا جائے تو ڈاکٹر انور صابر کی غزل کے حوالے سے دیا گیا بیان مات کھاتا دکھائی دیتا ہے کیوں کہ ڈاکٹر انور صابر نے غزل کو محض عورتوں سے عشق و محبت کی باتوں سے تعبیر کیا ہے:

"غزل میں سودائے ذکر شراب و کباب بیان خال و خط شاہد و رعنا، شکوہ، الم، مفارقت، ذکرِ وصال، بیانِ جفائے فلک، خوئے بد معشوق۔"(۲۵)

ڈاکٹر انور صابر کی رائے میں غزل محض شباب کباب تک محدود رہے اور معاملات و حسن و عشق کی حدود و قیود سے ماورا نہیں۔ جب کہ مطلوب حسین نے اردو غزل میں معاشرتی مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ لہٰذا اردو غزل میں معاشرتی مسائل کا پایا جانا ایک فطری عمل نہیں بل کہ وقت کی ضرورت تھی وقت کے بدلتے رجحانات کے ساتھ ساتھ غزل نے بھی اپنے محور سے ہٹنا شروع کیا اور نئے موضوعات کو وسعت عطا کی۔

ساغر صدیقی کی شاعری کا اگر بہ غور مشاہدہ کیا جائے تو ان کی شاعری میں مسائل کا ایک بہت بڑا دریا بہتا نظر آتا ہے بلکہ ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر پایا جاتا ہے جس کی گہرائی کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ساغر صدیقی بھی ایک درمیانے طبقے کی افراد میں سے تھے اور وہ بھی ایک ایسے معاشرے کا حصہ تھے جو ترقی پذیر بھی نہیں تھا بل کہ اس سے بھی نچلی سطح کا معاشرہ تھا۔

ساغر صدیقی سے بہ ظاہر تو معاشرے سے نظریں پھیری ہوئی تھیں مگر انہوں نے معاشرتی مسائل اور معاشرتی تبدیلیوں کو ضرور دیکھا اور معاشرتی عدم توازن کو اپنے کلام میں شامل کیا، ساغر نے غربت کو سب سے بڑا سماجی مسئلہ قرار دیا اور کہا کہ غربت ایسا مسئلہ ہے جو انسان کو ہر غلط کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ساغر کہتے ہیں کہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور معاشی عدم توازن غربت کی بڑی وجہ بنتی ہے۔ امیر طبقہ غریبوں کو اپنے برابر کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیکھا تو بھلا وہ کیسے غریب کو امیر ہوتا یا دو وقت کی روٹی کھاتا دیکھ سکتا ہے، غریب دور وقت کی روٹی کے لیے بڑی سر توڑ کوشش کرتا ہے مگر اسے دو وقت کی روٹی ملنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو کئی انسان رات کو بھوکے سو جاتے ہیں اور بعض تو روکھی سوکھی پر گزارا کرتے ہیں۔ غریب بیچارے سڑکوں پر سوتے ہیں اور مفاد پرست طبقہ محلوں میں عیاشی کرتا ہے۔ غریب بیچارہ گدڑی میں گزارہ کرتا ہے تو امیر کئی طرح کی پوشاک پہن کر اپنی دولت و لباس کی نمائش کرتے ہیں۔

ساغر کہتے ہیں کہ امیروں نے غریبوں سے دولت چھین لی ہے اور ان کی قسمت میں محض درد کی ٹھوکریں کھانا اور محنت مزدوری کرنا لکھا ہوتا ہے اسے کہاں اچھی تعلیم ملتی ہے۔ اُسے تو رات کو سونے کے لیے گھر بھی دستیاب نہیں ہوتا تو وہ کہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرے گا۔

غریب انسان کی قسمت میں محض رات کو تارے گننا لکھا ہے اور رات کے پہلو میں بیٹھ کر اپنے غموں دہرانا لکھنا ہے وہ زمانے کے حوادث کا شکار ہو کر موت کی لوریاں گاتا نظر آتا ہے اور ہمیشہ موت کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے۔ غریب کی ہر رات محض خیالات سے بھرپور ہوتی ہے۔ وہ محض خیالات کے سہارے سوتا ہے اور اس کی قسمت میں بھی دو وقت کا کھانا اور چھت کا سایہ ہو گا مگر اسے کیا معلوم کہ ظالم سماج اپنے مظالم میں ہمیشہ اضافہ کرتا رہتا ہے اور ہمیشہ غریبوں پر اپنے ظلم ڈھاتا رہے گا:

گل ہوتی شبنم شبستان کی چاند تارے سو گئے
موت کے پہلو میں شام غم کے مارے سو گئے
بے قراری میں بھی اکثر درد مندانِ جنون
اے فریب آرزو تیرے سہارے سو گئے
دے رہی ہے آج بھی موجِ حوادث لوریاں
سورشِ طوفان سے گھبرا کے کنارے ہو گئے (۲۶)

ہاں ابھی بھولی نہیں جور خزاں کی داستاں
احتیاطاً ہم نہیں کرتے بہار آنے کی بات
ہر نفس میں شعلہ زن ہیں گرمیاں حالات کی
زندگی ہے ان دنوں بے موت مر جانے کی بات (۲۷)

ساغر صدیقی نے سماجی مسائل کو ذاتی نوعیت کے مسائل قرار دیا ہے۔ ان مسائل کو منفرد اور اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ البتہ ساغر خود بھی اسی معاشرے کا حصہ تھے جہاں انسان کی کوئی قدر نہ ہو اور جہاں غریب کی قسمت میں محنت مزدوری کرنا لکھا ہو اور اس محنت مزدوری کے بدلے میں محض امراء کی ٹھوکریں کھانا لکھا ہو۔ ساغر نے معاشرتی عدم توازن پر اعتراض اٹھایا اور

معاشرتی برائیوں کی نکتہ چینی بھی کی۔

ساغر نے زندگی کو زہر کی ایک ایسی گولی قرار دیا جو کھانے سے موت نہیں آتی بل کہ زندگی اور بھی بڑھ جاتی ہے اور مسائل بھی خوب پھولتے پھیلتے ہیں۔ انسان کے آنسو محض آنسو نہیں رہتے بل کہ موتیوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ موتی شام کے وقت ستارے سے چہ مگوئیاں کرتے نظر آتے ہیں۔

ساغر کہتے ہیں کہ بعض لوگ تو اتنے امیر ہوتے ہیں کہ ان کے کتے بھی چارپائیوں پر سوتے ہیں مگر غریب انسانوں کی قسمت میں محض سڑک کا کنارہ اور آسماں کی چھت لکھا ہوتا ہے۔ اسی چھت جس پر کئی نیلے پیلے چمکتے ستارے گردش کر رہے ہوتے ہیں اور وہی ستارے غریب کے ساتھی اور ہم جولی ہوتے ہیں۔ غریب انسان کے لیے ہر موسم خزاں کا موسم ہوتا ہے کیوں کہ وہ خزاں کی طرح اجڑا ہوا ہوتا ہے۔ ساغر غریب کی زندگی میں مسائل کو بعض اوقات تقدیر کی ایسی ڈوری قرار دیتے ہیں جس کا ٹوٹنا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ ڈوری اس وقت ٹوٹتی ہے جب سانسیں پروردگار کے سپرد ہو جاتی ہیں۔ غریب انسان کی خالی جھولی اس کی دولت ہوتی ہے اور اس کا کام محض رین بسیرا ہوتا ہے اور دنیا کی تمام تکالیف کو برداشت کرنا ہے:

شام خزاں کی گم صم بولی
جیون لمحے زہر کی گولی
میرے آنسو اور ستارے
کھیل رہے ہیں آنکھ مچولی
چاند کا سایہ چھت سے اترا
ہمسائے نے کھڑکی کھولی
توڑ دیا دم دیوانوں نے
عمر جنوں کی پوری ہو لی
پھول بھی ہے وہ کانٹا بھی ہے
من میلا ہے صورت بھولی

لمبی ہے تقدیر کی ڈوری
کس نے ماپی کس نے تولی
اپنی دنیا رین بسیرا
اپنی دولت خالی جھولی[۲۸]

ساغر صدیقی کہتے ہیں کہ غریب کا سب سے بڑا جرم غربت ہے مگر بعض اوقات وہ غم و خوشی کا بھی مجرم ہو جاتا ہے۔ ساغر کے نزدیک زندگی میں منافقت کے کئی رنگ ہیں اور ان رنگوں کی چمک مختلف صورتوں میں موجود ہے۔ انسان نے محض اپنے پیٹ پالنے کو زندگی قرار دیا ہوا ہے۔ اسے کسی دوسرے کی کوئی فکر نہیں ے۔ یہاں ہر انسان کی کئی صورتیں موجود ہیں اور انسان ان صورتوں میں کئی روپ دکھا کے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے ساتھ معاشرے کو بھی دھوکہ دیتا ہے۔ اقربا پروری اور خاندانی رعب نے انسانوں سے انسانیت چھین لی ہے۔ ہر کوئی اپنے خاندان کے لیے فراد کی پرورش تک محدود ہے اسے کسی دوسرے کی کوئی فکر نہیں ہے۔

ہر انسان یہی چاہتا اسے فائدہ حاسل ہو چاہے وہ اپنے مفاد کے لیے انسانیت سے گر بھی جائے تو اسے زحمت نہیں ہوتی ہے۔ بعض افراد تو زحمت اور رسوائی کو اپنی شان و شوکت شمار کرتے ہیں۔ ان کا کام محض لوٹنا اور دولت اکٹھی کرنا ہے۔ ان کو معاشرے سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی ہے، وہ تو غریبوں کو دیکھنا بھی ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ساغر کہتے ہیں کہ یہاں ہر کوئی کسی نہ کسی طرح مجرم ہے جو مختلف جرائم کرتا ہے۔ غریب صرف اور صرف جینے کا جرم کرتا ہے۔ اس کا جرم صرف سانس لینا اور روزی کمانا ہے اور اس روزی کو کھانا بھی اس کے لیے جرم عظیم ہے۔ بڑے طبقے کے لوگ غریب سے اس کا کھانا چھین کر اسے دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرتے ہیں، بعض لوگ تو غریبوں کی کمائی ہوئی دولت پر فخر کرتے ہیں اور اس کا دولت کا ناجائز استعمال کر کے تسکین قلب حاصل کرتے ہیں:

غم کے مجرم خوشی کے مجرم ہیں
لوگ اب زندگی کے مجرم ہیں
استغاثہ ہے راہ و منزل کا
رہزن رہبری کے مجرم ہیں

دشمنی آپ کی عنایت ہے
ہم فقط دوستی کے مجرم ہیں(۲۹)

ساغر صدیقی نے معاشرے کے با اثر افراد پر گہرا طنز کیا ہے اور ان تمام مسائل جو معاشرے پر اثر انداز ہیں میں ان کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ساغر کہتے ہیں کہ زمانے کے بڑے بڑے امراء نے لوگوں کو لوٹ کر اپنے دروازوں کو بند کر دیا ہے اور یہ دروازے صرف اور صرف عیاش پرست طبقے کے لیے کھلتے ہیں۔ غریب کو کمانے کو کچھ نہیں ملتا ہے اور وہاں پر شراب و کباب کی محفلیں سجائی جارہی ہوتی ہیں۔ خاک نشین ہمیشہ سے خاک نشین رہے ہیں اور ان کی قسمت میں خاک چھاننا ہے، اور محض محنت مزدوری کر کے امیروں کا پیٹ بھرنا ہے۔ ساغر کہتے ہیں کہ بعض مفاد پرست لوگوں نے غریبوں سے ان کا روزگار چھینا اور ان کو گھروں سے نکال دیا۔ امراء اور با اثر افراد نے غریبوں کی عزتوں کی نیلامیاں سرِ عام کیں اور اگر کوئی ان کی راہ میں رکاوٹ بنتا تو وہ اسے قتل کر دیتے تھے۔ بعض لوگوں نے تو خود کو خدا سمجھ لیا تھا اور وہ لوگوں پر اپنے احکامات اس قدر مسلط کر دیتے تھے جیسے وہ خدا ہیں اور زمانے کے خداؤں نے غریبوں کی سانس ہمیشہ بند کیں اور اپنے مفاد کے لیے غریبوں کو ہر طرح سے استعمال کیا اور غریبوں کے لہو سے اپنے ہاتھ رنگنے میں کوئی کوتاہی نہ چھوڑی۔

ساغر کہتے ہیں کہ زمانے کی ستم ظریفی نے غریب کو صرف اور صرف جھکنا سکھایا ہے اور زمانے کے خداؤں کے احکامات کی پیروی کا درس دیا ہے۔ ان کی قسمت میں کہاں لکھا ہے کہ وہ اپنے حقوق کی بات کریں۔ ان کے حقوق کے زمانے کے خداؤں نے چھین رکھے ہیں۔

ساغر کہتے ہیں کہ زمانے کے خداؤں نے غریبوں کی آواز کو گونجنے نہیں دیا اگر کسی نے آہ و بکا کی بھی ہو تو آسمان نے اس کی آواز کو پیوند لگا دیا اور اس کی آواز محض ایک رائیگاں آہ بن گئی۔ زمانے کا ہر ستم گر ستم ڈھاتا ہے اور بھٹکے ہوئے انسان سب کے مظالم کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے قافلے کی زینت بن جاتے ہیں۔ جس کی نہ تو کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی راستہ۔ ہر انسان محض تلاش حق کا خواہش مند ہے، مگر صدقِ دل سے قطعاً نہیں۔ انسان کے ظاہر و باطن میں تضاد کرے۔ اس کو بے بس اور لاچار بنا دیا ہے اور وہ منافقت کا سہارا لینے لگا ہے اور منافق لوگوں کے چنگل نے اسے اپنی آغوش میں لے کر دبوچ لیا ہے۔ انسان محض خیالات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور اس کے

خیالات کا آغاز اور اختتام محض روٹی سے ہوتا ہے:

آلام کی یورش میں بھی خورسند رہے ہیں
نیرنگیٔ حالات کے پابند رہے ہیں
آفاق میں گونجی ہے مری شعلہ نوائی
نالے مرے افلاک کے پیوند رہے ہیں
ڈالی ہیں ترے خاک نشینوں نے کمندیں
ہر چند محلات کے در بند رہے ہیں
ہر دور میں دیکھا ہے مری فکر رسا نے
کچھ لوگ زمانے کے خداوند رہے ہیں
ساغر نہ ملی منزل مقصود خرد کو
یاں قافلہ سالار جنوں مند رہے ہیں[۳۰]

غربت ایسا سماجی مسئلہ ہے جس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس مسئلہ کا حل تلاش تو کیا جا سکتا ہے مگر اس کا حل اس صورت میں ممکن ہے جب دولت کی منصفانہ تقسیم ہو اور معاشرے میں نا انصافی ختم کی جائے اور غریب کو اس کا حق دیا جائے۔ مگر انسان ہمیشہ لالچی رہا ہے اسے دولت سے پیار ہے وہ نہیں چاہتا کہ جو سانپ اس نے اپنی آستین میں چھپا رکھا ہے کسی اور کو ڈسے۔

البتہ غربت کا مسئلہ سماجی حالات پر گہر نقش چھوڑتا ہے۔ مگر بعض اوقات انسان پریشان ہو جاتا ہے اور تمام امیدیں کھو بیٹھتا ہے۔ ساغر صدیقی انسان کو ہمیشہ حوصلہ دیتے نظر آتے ہیں۔ مگر ان کے حوصلے محض ظلمتوں کے دریا میں بہنے والی کشتی کے مسافر ہیں۔ جن کے ڈوبنے میں تاخیر نہیں۔ ساغر کے کلام میں رجائی عناصر بھی ملتے ہیں وہ مایوسی کے بادلوں سے بارش برسانے کے قائل نہیں ہیں بلکہ رجائیت کے بہتے سمندر میں بہہ جانے کے خواہش مند ہیں:

آنکھ روشن ہے جیب خالی ہے
ظلمتوں میں کرن سوالی ہے
حادثوں نے رباب چھیڑے ہیں
وقت کی آنکھ لگنے والی ہے[۳۱]

یہی ظلمتیں چھنیں جو ترے سرخ آنچلوں میں
انہی ظلمتوں سے شاید مرے گھر میں رشنی ہے
مرے ساتھ تم بھی چلنا مرے ساتھ تم بھی آنا
ذرا غم کے راستوں میں بڑی تیز تیرگی ہے
غم زندگی کہاں ہے ابھی وحشتوں سے فرصت
ترے ناز اٹھا ہی لیں گے ابھی زندگی پڑی ہے
وہ گزر گیا ہے ساغر کوئی قافلہ چمن سے
کہیں آگ جل رہی ہے کہیں راکھ سو گئی ہے[۳۲]

مہنگائی بھی ایک سنگین سماجی مسئلہ ہے۔ ہر ذی روح کو جینے کے لیے ضروریات زندگی پر انحصار کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ ضروریات زندگی آسانی سے مل جائیں تو انسان خوشی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہے۔ مگر ان ضرریات زندگی کا مہنگا ملنا زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ بعض انسان تو مہنگائی سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتے ہیں، مگر امیر لوگ مہنگائی کو ایک فیشن قرار دیتے ہیں اور مہنگی چیزیں خریدنے کو اپنی عزت کا مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ مگر جس انسان کو دو وقت کی روٹی بھی بہ مشکل ملے اسے تو مہنگائی قیامت سے بھی بڑی چیز لگتی ہے۔

معاشرتی عدم توازن اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے مہنگائی میں اضافہ ہوتا ہے اور بعض اوقات جس چیز کی طلب بڑھ جاتی ہے وہ مہنگی ہو جاتی ہے امیر لوگ مہنگی چیزیں خرید کر اپنے روپے پیسے کی نمائش کرتے ہیں اور غریب ننگے جسم کی نمائش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ساغر کہتے ہیں کہ مہنگائی نے غریبوں کی عزت نفس کو بڑی ٹھیس پہنچائی ہے اور غریب کی عزت کا سودا اس کی مجبوری کی عوض کیا جاتا ہے اور اس کی عصمت درازی چند روپوں یا اشیائے ضرورت کے لیے کی جاتی ہے۔ غریب محض ایک پتلے کی طرح بازاروں میں نمائش کرتا نظر آتا ہے:

بازار آرزو کی نوا ، دام چڑھ گئے
ہر چیز قیمتوں سے سوا دام چڑھ گئے

ہے غازہ بہار سے محروم ان دنوں
مخمور گیسوؤں کی گھٹا دام چڑھ گئے
اب قرض مئے بحال ہو مشکل ہے دوستو
کہتی ہے میکدے کی فضا دام چڑھ گئے
مریخ اور زہرہ کئی قیمتوں کے نام
ذروں نے مسکرا کے کہا دام چڑھ گئے
ہر ماہ لٹ رہی ہے غریبوں کی آبرو
چڑھنے لگا ہلال قضا دام چڑھ گئے
ہے احتساب زیست کی لٹکی ہوئی صلیب
ہر روز جیسے روز جزا دام چڑھ گئے
نقد خرد سرور تمنا کا مول ہے
ارماں کا رنگ زرد ہوا دام چڑھ گئے
اے وقت مجھ کو غیرتِ انسان کی بھیک دے
روٹی میں بک گئی ہے دوا دام چڑھ گئے(۳۳)

ناانصافی، غربت اور تعلیم کے مسائل اور اس کے ساتھ ساتھ بھوک اور افلاس کے مسائل اور ان کے محرکات ساغر صدیقی کی شاعری کا حصہ ہیں۔ ساغر صدیقی نے محض جذبات و احساسات کو اپنے شاعری کا حصہ نہیں بنایا بل کہ حقیقی واردات اور معاشرتی برائیوں کی لفظوں کا عمل جامہ پہنا کر صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے ان کی شاعری غریب کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتی ہے اور غریب ہی اس کی شاعری کا اصل محور ہے۔ وہ غریب کے مسائل کو اچھی طرح سمجھتے تھے، کیوں کہ وہ خود ایک غریب انسان تھے۔

ساغر صدیقی کی شاعری میں مے خانہ ایک زوال کے استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ساغر صدیقی نے مئے خانہ کو قوموں کے زوال کی وجہ قرار دیا ہے اور اسے معاشرے میں ناانصافی اور ظلم و ستم میں اضافہ کی وجہ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سارے لوگ مئے نوشی کو اپناوطیرہ بناتے ہیں اور مئے نوشی کرنے میں اپنی خوشی محسوس کرتے ہیں وہ لوگ بعض اوقات اپنے

رشتہ دار عزیز واقارب سب کو بھول جاتے ہیں اور اخلاقی اقدار کی پامالی کرتے ہیں۔ ساغر کے نزدیک اخلاقی اقدار کسی بھی معاشرے کی ترقی وخوش حالی کاموجب بنتی ہیں اور انسان اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر زندگی گزارے تو وہ بہت سارے مسائل سے بچ جاتا ہے۔ دورِ حاضر کا انسان مئے نوشی صرف لذت کے حصول کے لیے کرتا ہے اور معاشرے میں موجود دوسرے لوگوں کا امن خراب کرنے کے لیے کرتا ہے۔ دورِ جدید کے انسان صرف اور صرف لالچی واقع ہوئے ہیں اور صرف وہ اپنے مفاد کے لیے دوسروں کے حقوق کی تلفی کرتا ہے اور دوسروں کے حقوق تلف کر کے اپنی زندگی گزارنے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔

ساغر کہتے ہیں کہ معاشرے میں ظلم وستم اور ناانصافی انسان کو غربت کی جانب گامزن کرتے ہیں اور اسے اپنی آغوش میں لے کر تہس نہس کر دیتے ہیں۔ انسان جب حالات سے گھبرا جاتا ہے اور تمام امیدیں کھو بیٹھتا ہے تو مئے خانہ ہی واحد اس کا سہارا ہوتا ہے جو اسے تسکین فراہم کرتا ہے اور دنیاوی غموں سے چھٹکارادلاتا ہے۔ مگر یہ بات خلافِ قیاس اور خلافِ عقل ہے کیوں کہ مئے خانہ ہی معاشرے میں ظلم وستم اور فسادات کا موجب بنتا ہے۔ شراب نوشی کرنے والے معاشرے میں کئی طرح کے واقعات رونما کرتے ہیں اور معاشرے میں چوری ڈاکے اور قتل وغارت کو پروان چڑھاتے ہیں۔ مایوس انسان زمانے کے غم اپنی آغوش میں لے کر شراب نوشی جیسی بری عادت کو اپناوطیرہ بناتا ہے اور نشے کی حالت میں دھت رہ کر دنیااور اس میں موجود مسائل سے آنکھ پھیرلیتا ہے۔

ساغر کہتے ہیں کہ درد بھرے اور دکھوں سے لبریز زمانے میں خوشیوں کا ملنا خلافِ قیاس ہے اور ناممکن ہے۔ ہر انسان مسائل سے تنگ ہے اور مسائل نے ہر چیز بل کہ ہر ذی روح پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ پھول پتے اور درخت بھی سوکھ چکے ہیں اور پھولوں کو پت جھڑنے اپنی گرفت میں لے کر تباہ وبرباد کر دیا ہے اور پھولوں کی خوب صورتی حالات کی نذر ہو گئی ہے۔ اس نازک دور میں اس قدر دکھی اور پریشان ہیں کہ وہ اپنی تباہی اور بربادی پر افسوس بھی نہیں کر سکتے ہیں اور اپنی حالت زار پر اشک نہیں بہا سکتے۔ مہنگائی کے اس دور میں اشک اس قدر مہنگے ہو گے دیکھنے کو بھی نہیں ملتے اور غم کی نے انسان کو برباد کر دیا ہے اور وہ مئے خانے کی سہارا لنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ساغر کہتے ہیں کہ شراب نوشی کرنے والے آوارہ لوگ ہوتے ہیں اور ان کو کسی بھی شخص

کی کوہی قدر نہیں ہوتی ہے اور وہ اخلاقی اقدار کو تہس نہس کرتے ہیں۔لوگوں کے حقوق کی پامالی کرنے والے بھلا انسانیت کے حقوق کا درس کس طرح دے سکتے ہیں۔ دکھی انسان اپنی دنیا میں مگن ہو کر اپنی عزت نفس کو حالات کی نذر کر دیتا ہے۔ اور زمانے کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر وہ مئے خانے میں اپنی عافیت محسوس کرتا ہے اور نشے میں دھت ہو کر زمانے کے درد و غم بھول جاتا ہے:

سوکھ گئے پت جھڑ میں پات
ٹوٹ گئے پھولوں کے ہات
کتنا نازک ہے یہ دور
اشکِ گراں ، غم کی بہتات
ہم دیوانے ، ہم آوارہ
چل نہ سکو گے اپنے سات
ساغر مے خانے میں ہو گا
چھوڑ بھی دو پگلے کی بات(۳۴)

میکدے کے سوا ، ہمارا پتہ
ان کی زلفوں کے آس پاس ملا(۳۵)

ساغر کہتے ہیں کہ مے کدے نے کئی لوگوں کو غربت کی طرف دھکیل دیا ہے اور وہ غربت کی لپیٹ میں آ کر در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لوگ غربت سے اس قدر تنگ ہیں کہ وہ اپنی عزت نفس کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں اور حصول روزگار کے لیے لوگ کئی طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں لوگوں میں منافقت نے مسائل میں مسلسل اضافہ کیا ہے اور بدلتے وقت اور بدلتے رجحانات نے معاشرے میں کئی طرح تبدیلیاں لائی ہیں۔ دور جدید میں مے خانہ ایک سماجی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ شراب کے نشے میں لت بت انسان اخلاقی اقدار سے اجتناب کرتا ہے اور اپنے پرائے میں فرق بھول جاتا ہے اور اپنے ہوش و حواس کھو کر زمانے میں انتشار پھیلاتا ہے۔

ساغر کہتے ہیں کہ غریب کا دل بادشاہ ہوتا ہے اور اس کے دل میں خوف میں خوف خد ہوتا ہے اور وہ معاشرے میں امن و امان قائم رکھتا ہے اسے معاشرے کے اندر رونما ہونے والے

واقعات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اسے تو صرف اور صرف روزگار کا مسئلہ ہوتا ہے اور دو وقت کی روٹی کی فکر ہوتی ہے۔ مگر امیروں کو طرح طرح کی عیاشی کی سوجھی ہوتی ہے اور وہ اپنی عیاشی کے لیے کئی طرح کے سامان فراہم کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو وہ اپنے مفاد کے لیے غریبوں کا خون بہانے میں خوشی محسوس کرت ہے اور اس کے دیل میں کوئی خوف خدا نہیں ہوتا ہے اور اس کی عادات میں شامل ہوتا ہے کہ وہ غریبوں کو تنگ کرے اور ان کا استحصال کرے۔ امیر زمانے بھر کی خوشیوں کو اپنی وراثت سمجھتے ہیں اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ہر حد عبور کرتے ہیں اور غریبوں کا حق چھین کر ان کو مسائل کی طرف دھکیل دیتے ہیں اور غریب بے چارے مسائل سے تنگ آ کر نشے کی لت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور نشے کو معمول بنا کر اپنی زندگی کو برباد کرتے ہیں۔

ساغر کہتے ہیں کہ انسان نشے جیسی بری عادات کو اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ زمانے کی ستم ظریفی سے مکمل طور پر تنگ آ چکا ہوتا ہے اور وہ زمانے کے ظلم و ستم سے خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ زمانہ جب اس پر ظلم ڈھاتا ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور اپنی بربادی کو اپنی خوشی کا ساماں سمجھتا ہے اور اسی میں اپنی عافیت محسوس کرتا ہے   مے نوش زمانے بھر کے کرب سہ کر اپنے دل کو اس قدر مضبوط کر لیتا کہ زمانے بھر کا غم اس کے دل میں سما سکتا ہے اور وہ زمانے کے منافق لوگوں کو بھول جاتا ہے جو اسے برباد کرتے ہیں اور اس پر کئی طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ وہ زمانے بھر کے دکھوں کو سمیٹ کر ہنسی خوشی زندگی گزارنے کی ناکام کوشش کرتا ہے اور اس امید میں وہ ساری عمر مفلسی میں گزار دیتا ہے۔

ساغر کہتے ہیں کہ زمانے میں موجود حادثات نے مے نوش کی زندگی میں کئی طرح کی تبدیلیاں لائی ہیں اور اس کی زندگی میں نت نئے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ وہ زمانے کے دکھ اپنے دل میں بسا کر ان پر اشک بہاتا ہے اور اپنی حالت نازک پر قہقہ لگاتا ہے۔ ساغر کہتے ہیں کہ غریب کے دل میں جینے کی خواہش موجود ہوتی ہے مگر ظالم سماج کے لوگ اس سے اس کی زندگی کی تمام خواہشات چھین لیتے ہیں اور اسے موت کی جانب دھکیل دیتے ہیں۔ ساقی کا استعارہ ساغر کی شاعری میں بھی استعمال ہوا ہے اور ساغر نے اس استعارے کو اک زوال کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور اسے مے نوش کی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ساغر نے زمانے بھر کے ظلم و ستم کی داستان بیان کی ہے اور اس داستان کو حیاتِ جاوداں بخشی ہے۔ انہوں نے زمانے بھر کے ظلم و ستم کو مے

خانے میں لا کر سمیٹ دیا ہے۔ ان کے نزدیک شرابی ایک معصوم اور بے بس انسان ہے اور وہ زمانے بھر کے ظلم و ستم برداشت کرتا ہے اور اپنی خودی کا سودا نہیں کرتا ہے اور اس کے دل میں جذبہ انسانیت موجود ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی سادگی سے بسر کرنا چاہتا ہے مگر ظالم سماج کے لوگ اس کو جینے نہیں دیتے اور اس کی زندگی کو اجیرن کر دیتے ہیں۔

داغ دل کے شہنشہ کے سکے نہیں
دل کا مفلس کدہ کب کا خزانہ ہوا(۳۶)

دے حادثاتِ نو کی صراحی سے ایک جام
ساقی کو دوا اترنے لگا ہے خمارِ زیست(۳۷)

ساقی تجھے بھی چاہیے اک زخم تشنگی
کتنے لگیں دام ، ذرا آنکھ تو ملا(۳۸)

ساغر کہتے ہیں کہ غریب زمانے بھر کے ظلم و ستم سے تنگ آ جاتا ہے اور اسے زندگی سے کوئی پیار نہیں رہتا اور وہ زندگی سے مکمل طور پر روٹھ جاتا ہے اور موت کی طرف بھاگنے لگ جاتا ہے اور موت کو زندگی سے بہتر نعمت سمجھتا ہے۔ کیوں کہ اس کے لیے موت ہی وہ واحد سہارا ہوتی ہے جو اسے تمام مسائلِ زندگی اور دکھوں سے نجات دلاتی ہے۔ جس طرح شگوفے کے بغیر تازگی اور تازگی کے بغیر شگوفہ ادھورا ہوتا ہے اسی طرح مے نوش اور غریب بھی سامان زیست کے بغیر نامکمل ہوتا ہے اور زمانے میں موجود ظلم و ستم کو ایک نئی روح اور سوچ عطا کرتا ہے اور اپنے اندر اتنی طاقت پیدا کر لیتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر لیتا ہے کہ وہ روشنی کے بغیر بھی ظلمتوں کو نکھار سکتا ہے اور زلف جاناں کی خواہش کو اپنے لیے اذیت سمجھ کر اس سے دور رہنا چاہتا ہے تاکہ اس کی زلف کا سایا اسے بد سکونی نہ عطا کر دے اور اس میں جینے کی خواہش ناپید اہو جائے اور وہ زندگی سے سے پیار نا کرنے لگ جائے

ساغر کہتے ہیں کہ زندگی غریب کو کئی طرح کے امتحانات سے گزارتی ہے اور اس کا کڑا امتحان لیتی ہے اور وہ بھی اپنی زندگی مین کام یابی چاہتا ہے مگر زندگی وہ واحد امتحان ہے جس کو پاس

کرنا غریب کے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر غریب بہتر زندگی کی خواہش کرے تو اس کا عزت نفس کا قائم رہنا خلاف قیاس اور خلاف سوچ ہے۔ غریب مسائل سے تنگ آکر اپنی عزت نفس کو بھول جاتا ہے اور زمانے کے ظلم کی تاریکی میں کھو جاتا ہے اور ظلم اس سے اس کی بینائی چھین لیتے ہیں اور اس اندھا کر کے مسائل کے کنویں میں دھکیل دیتے ہیں۔ غم ہی وہ واحد سرمایا ہوتا ہے جو غریب کا ہمیشہ ساتھ دیتا ہے اور وہ اسی کا لبادہ اوڑھ کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حالات کی ستم ظریفی اس سے اس کا سکون چھین لیتی ہے اور وہ دکھوں کو اپنی آماج گاہ سمجھ کر زندگی کی لذت سے حظ اٹھاتا ہے اور بعض اوقات وہ حواس باختہ ہو کر اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہے۔ ساغر کہتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ٹوٹے ہوئے جام یعنی لوگ تشنگی یعنی زندگی سے روٹھ جائیں گے اور پنا الگ میکدہ کھول لیں گے اور ایک الگ دنیا مرتب کر لیں گے اور اپنے حق کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے اور نقلاب برپا کر دیں گے اور اس انقلاب کی وجہ سے ان کے حق ان کو مل جائیں گے مگر ایسا کہنے کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر عملی طور پر ایسا کرنا نہ ممکن ہے اور غریبوں کے خواب محض ادھورے خواب ہیں جن کا پورا ہونا ناممکن ہے اور خلاف قیاس ہے اور خلاف عقل بھی ہے۔

ساغر کہتے ہیں کہ محبوب بھی انسان کو نشے کی لت لگا دیتا ہے اور اسے شراب نوشی جیسی بری عادت سے نواز دیتا ہے۔ محبوب ہی وہ واحد سہارا ہوتا ہے جو اس کی زندگی میں خوشیاں اور رنگ بھر سکتا ہے مگر ایسا ناممکن ہے اور وہ محبوب ہی کیا محبوب ہو گا جو اس پر ظلم و ستم نا ڈھائے اور اسے اپنی چالاک نظروں کے جام نہ پلائے اور اسے اپنی محبت میں گرفتار کر کے دھوکہ نہ دے اور اس کا سکون اور چھین نہ چھینے۔ ہر عاشق کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ محبوب کی گلی میں جائے اور اس کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو خیرہ کرے اور اپنے دل کو تسکین پہنچائے اور اس کے حسن کے جلوے سے حظ اٹھائے مگر ایسا نہ ممکن ہے کیوں کہ محبوب اس قدر ظالم ہے اور وہ اپنے عاشق پر کئی طرح کے ظلم ڈھاتا ہے اور جب عاشق اس کی ستم ظریفی سے تنگ آجاتا ہے اور بے بس ہو جاتا ہے تو مے خانہ ہی وہ واحد سہارا ہوتا ہے جو اسے تسکین فراہم کرتا ہے اور وہ مے خانے کو محبوب سمجھ کر اس کی پوجا پاٹ کرنے میں اپنی عافیت سمجھتا ہے اور مے خانے کے دروازے سے لگ کر اپنی قسمت پر اشک بہاتا ہے۔ اگر اس کو اس کے محبوب کی گلی سے نکال دیا جائے تو وہ کہاں جا سکتا ہے؟ اس وقت

مے خانہ ہی اسے نئی زندگی عطا کرتا ہے اور زندگی کے تلخ حقائق اور پیچ و خم سے آگاہ کرتا ہے:

ہنس نہیں سکتے شگوفے تازگی سے روٹھ کر
ہم زمانے میں جئے ہیں زندگی سے روٹھ کر
زلفِ جاناں سے ملی فکر و نظر کی چاندنی
ظلمتیں ہم نے نکھار دیں روشنی سے روٹھ کر
خود منانے کے لئے آئے مجھے دَیر حرم
سجدہ ایہام پایا زندگی سے روٹھ کر
غم سے رونق ہو گئی کاشانہ تقدیر میں
مطمئن ہے دل کی دنیا ہر خوشی روٹھ کر
ایک دن ساقی یہی ٹوٹے ہوئے جام و سبو!
میکدے ترتیب دیں گے تشنگی سے روٹھ کر
سوچتے ہیں حسرتوں کے موڑ پر شام و سحر
جائیں گے ساغر کہاں ان کی گلی سے روٹھ کر(۳۹)

ساغر نے زمانے بھر کے غم اپنی جھولی میں سمیٹ کر بیان کیا ہے کہ زمانے بھر کے غم ان کے حصہ میں آئے ہیں اور وہ ہر اس شخص کے جزبات کی عکاسی کرتے ہیں جس نے زمانے کے ظلم و ستم سہے اور ان مظالم پر نوحہ خوانی کی ہو اور اسے زمانے بھر کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانے میں جب ظلم و ستم عام ہو گا اور ناانصافی ہو گی تو انسان مسائل کی آغوش میں پسیج جاتا ہے اور زمانے بھر کے درد و غم اس کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں تو اس مے نوشی اپنا سہارا دے کر آگے بڑھنے کا جزبہ عطا کرتی ہے اور اسے تمام مسائل سے دور ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں پر کوئی دکھ غم اور پریشانی نہیں ہوتی اور انسان اپنی دھن میں مست رہتا ہے۔ ساغر کہتے ہیں کہ انسان دکھوں کی سیاہ رات اور دقیق زندگی کو نہیں سمجھ سکتس ہے اور اس کی عقل ناقص اس دقیق فلسفہ کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ مشکلات اور مسائل سے گھبرایا ہوا انسان محض ایک ایسا پتلا بن کر رہ جاتا ہے جو احساسات اور جزباتِ انسانی سے عاری ہو۔

ساغر کے نزدیک یہ دنیا حادثات کا نام ہے اور اس میں ہر روز نت نئے حادثات رونما

ہوتے رہتے ہیں اور کئی لوگوں کی زندگی تماشہ بنتی اور رقص کرتی دکھائی دیتی ہے۔انسان کوئی فرشتہ نہیں ہوتا ہے جو تمام مسائلِ زندگی پر قابو پا سکے اور اپنی ناآسودہ خواہشات کا ازالہ کر سکے۔وہ کہتے ہیں کہ حادثاتِ زندگی انسان کو کئی طرح کی نعمتوں سے محروم کر دیتے ہیں اور انسان اپنی مشکل زندگی سے تنگ آ کر مئے خانے کا سہارا لیتا ہے اور تمام مسائل اور مشکلات زندگی پر تاسف کرنے کی بجائے وہ پینے پلانے میں اپنی بقاء سمجھتا ہے اور شراب نوشی جیسی بری عادات کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتا ہے اور اپنے لیے اور معاشرے کے تمام لوگوں کے لئے پریشانی کا موجب بنتا ہے اور جب وہ مسائل کی گرفت میں آ جاتا ہے تو اپنی عزتِ نفس کا سودا سستے داموں میں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور دنیا سے بے خبر ہو کر کہہ اٹھتا ہے:

میں تلخئ حیات سے گھبرا کے پی گیا
غم کی سیاہ رات سے گھبرا کے پی گیا
اتنی دقیق شے کوئی کیسے سمجھ سکے
یزداں کے واقعات سے گھبرا کے پی گیا
چھلکے ہوئے تھے جام ، پریشان تھی زلفِ یار
کچھ ایسے واقعات سے گھبرا کے پی گیا
میں آدمی ہوں کوئی فرشتہ نہیں حضور
میں آج اپنی ذات سے گھبرا کے پی گیا
دنیائے حادثات ہے اک درد ناک گیت
دنیائے حادثات سے گھبرا کے پی گیا
کانٹے تو خیر کانٹے ہیں ان سے گلہ ہی کیا
پھولوں کی واردات سے گھبرا کے پی گیا
ساغر وہ کہہ رہے تھے کہ پی لیجیے حضور
ان کی گزارشات سے گھبرا کے پی گیا[۴۰]

زندگی کے غموں سے نڈھال اور مسائل کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے کرتے ساغر تھک چکے تھے اور ان کی صحت آخر کار جواب دینے لگی تھی۔انہوں نے اپنی تمام خواہشات کو رد کر

کے دوسرے جہاں کا سفر شروع کر دیا تھا۔ ایسے جہاں کا جہاں کوئی غریب نہ ہو کوئی مسئلہ زندگی نہ ہو۔ آخر کار ساغر اپنے تمام سانسیں مکمل کیں اور اپنے چاہنے والوں کو کہا:

یاد رکھنا ہماری تربت کو
قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا(۴۱)

حوالہ جات

۱۔ ساغر صدیقی: ''کلیاتِ ساغر''(مرتبہ) فرزانہ جمالی، فیضان اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۱۸۔۱۹

2۔ ساغر صدیقی: ''کلیاتِ ساغر'' نواب سنز پبلی کیشنز، راولپنڈی، س ن، ص ۴۴

۳۔ ایضاً، ص ۵۷

۴۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۵۔ مرزا اسداللہ خاں غالب: ''دیوان غالب، بہ تصیح متن'' (ترتیب) حامد علی خاں، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، س ن، ص:۶۹

۶۔ ساغر صدیقی: ''کلیات ساغر'' ص ۴۵

۷۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۷

۹۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۰۔ ساغر صدیقی: ''کلیات ساغر'' (مرتبہ) فرزانہ جمالی، ص ۲۲۔۲۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۰۔۲۱

۱۳۔ ایضا

۱۴۔ مطلوب حسین: ''اردو غزل میں حزنیہ عناصر'' لائل پور پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۹۵۔۹۶

۱۵۔ ساغر صدیقی: ''کلیات ساغر'' ص ۱۲

۱۶۔ ثمینہ ندیم، پاکستان میں اردو غزل ایک حسیاتی مطالعہ، قرطاس، فیصل آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۷

۱۷۔ ساغر صدیقی: ''کلیات ساغر'' ص ۲۱

۱۸۔ ایضاً، ص۲۰

۱۹۔ مطلوب حسین: "اردو غزل میں حزنیہ عناصر" ص۲۳۸

۲۰۔ ساغر صدیقی: "کلیات ساغر" ص۸

۲۱۔ ایضاً، ص۱۸

۲۲۔ ایضاً، ص۲۲

۲۳۔ ایضاً، ص۲۸

۲۴۔ ایضاً، ص۳۲

۲۵۔ مطلوب حسین: "اردو غزل میں حزنیہ عناصر" ص۳۱

۲۶۔ ڈاکٹر انور صابر: "پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۱۷

۲۷۔ ساغر صدیقی: "کلیات ساغر" (مرتبہ) فرزانہ جمالی، ص۲۴۸

۲۸۔ ایضاً، ص۲۶۰

۲۹۔ ایضاً، ص۲۴۶

۳۰۔ ایضاً، ص۲۳۸

۳۱۔ ایضاً، ص۱۹۴

۳۲۔ ساغر صدیقی: "کلیاتِ ساغر" ص۲۶

۳۳۔ ایضاً، ص۳۱

۳۴۔ ایضاً، ص۶۳، ۶۴

۳۵۔ ایضاً، ص۴۸

۳۶۔ ایضاً، ص۵۴

۳۷۔ ایضاً، ص۶۲

۳۸۔ ایضاً، ص۶۲

۳۹۔ ایضاً، ص۶۸-

۴۰۔ ایضاً، ص۲۱

۴۱۔ ایضاً، ص۲۲۹



نام : ڈاکٹر محمد زمان پرویز

تعلیم : ایم اے ، ایم فل ، پی ایچ ڈی اردو

تصانیف :

- ایجاز و اختصار
- روپ انوپ (ڈرامے)
- اقبال کی داستان سرائی
- فرہنگ محاورات داغ
- کرونا وائرس کے دنوں میں محبت
- حقیقت حقیقی کا روح رواں منٹو (باانداز نوع)

رابطہ :

+923004743115